



اصلی اور فرعی مسائل میں مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے کے فقہی ضابطے

تالیف : ڈاکٹر احمد بن سعد الغامدی ^{رح}
سابق استاذ قسم عقیدہ، دراسات علیا
جامعۃ أم القرى، مکہ مکرمہ

پیشکش : ڈاکٹر سعد بن علی الشہرانی
سیکرٹری جنرل، عالمی تنظیم علماء مسلمین
مکہ مکرمہ

ترجمہ : ڈاکٹر صہیب حسن
سیکرٹری، اسلامک شریعہ کونسل
لندن، برطانیہ

اصلی اور فرعی مسائل میں مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے کے فقہی ضابطے

تالیف: ڈاکٹر احمد بن سعد الغامدیؒ
سابق استاذ قسم عقیدہ و دراسات علیا
جامعۃ أم القرى مکہ مکرمہ

پیشکش: ڈاکٹر سعد بن علی الشہرانی
سیکرٹری جنرل عالمی تنظیم علماء مسلمین
مکہ مکرمہ

ترجمہ: ڈاکٹر صہیب حسن
سیکرٹری اسلامک شریعہ کونسل
لندن برطانیہ

اصلی اور فرعی مسائل میں مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے کے فقہی ضابطے

تالیف: ڈاکٹر احمد بن سعد الغامدی رحمہ اللہ (م ۱۴۳۴ھ)

تلخیص و ترجمانی: ڈاکٹر صہیب حسن

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه
أجمعين

بعد ازیں گزارش ہے کہ قرآن میں کثرت سے ایسی آیات ہیں جو آپس میں شیر و شکر رہنے
و جماعت کا ہاتھ تھامنے اور اختلاف و تفرقہ بازی سے اجتناب کرنے سے متعلق ہیں۔ جیسے ارشاد
برہی تعالیٰ ہے:

واعتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ { (آل عمران: ۱۰۳)

”اور اللہ کی رسی کو تم سب مل کر تھام لو اور فرقوں میں تقسیم نہ ہو۔“

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ {

نعم: ۱۵۳}

”اور یہ کہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر

مت چلو کہ وہ راہیں تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔“

چنانچہ الفت اور محبت سے رہنمائی کی اساسی تعلیمات میں سے ہے اور خاص طور پر ان اوقات میں
جب نئے نئے مسائل کا سامنا ہو اور فتنے برپا ہوں اور اسی طرح پر اگندہ زندگی سے بچا جاسکتا ہے جو
تجدد کی قوت ہے بغض و کینہ پیدا کرتی ہے اور باہمی قوت و طاقت کو چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔

سرمئی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ قوت و طاقت اور ضعف و
نہایت کے اسباب کیا ہیں اور یہ کہ الفت و محبت کے ساتھ عزت اور افتخار وابستہ ہے اور فرقہ
پرستی و اختلاف کے ساتھ ذلت اور ضعف جڑے ہوئے ہیں۔ ہر دور میں یہی ہوتا رہا ہے اور یہی

سنت کائنات ہے۔ اور یہ بھی دیکھا گیا کہ جوں جوں جھگڑے بڑھتے رہے اور دامن اسلام کو تار تار کیا جاتا رہا تو ر فوگری بھی کسی کام نہ آسکی۔ اور پھر اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر ترقی مطلوب ہے تو پھر کوشش کی جانی چاہیے کہ بات ایک ہو، صفوں میں اتحاد ہو، جماعت اکٹھی رہے، ناجائز اختلاف کا قلع قمع ہو اور یوں تہذیب و تمدن کے میدان میں اس امت کے قول کا وزن ہو اور اس کا جھنڈا سرنگوں نہ ہو۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کا یہ کام ان علماء ربانیین سے متعلق ہے جو انبیاء کے علم کے وارث ہیں اور انمہ ہدایت ہیں اور ظلمت شب میں قنادیل نور ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے استاذ مکرم ڈاکٹر احمد بن سعید بن حمدان غامدی کو اس بات کی توفیق دی کہ وہ اس مسئلہ کی پوری طرح چھان بین کریں، مرض کی تشخیص بھی کریں اور دوا بھی تجویز کریں، اپنی تحقیق کا حاصل انہوں نے اپنی اس کتاب میں سمودیا ہے ”جس کا عنوان ہے:“ اصلی اور فرعی مسائل میں مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے کے فقہی ضابطے۔“ حق یہ ہے کہ انہوں نے زخم پر ہاتھ رکھا ہے اور اپنی خداداد بصیرت اور علم کی روشنی میں اس کے لیے مرہم تجویز کیا ہے اس موضوع کو ہر زاویے سے دیکھا اور پرکھا ہے، بنیاد بھی فراہم کی ہے اور اس پر پوری عمارت بھی اٹھائی ہے، اصول و ضوابط کو خوب نکھار کے پیش کیا ہے اور اللہ سے دعا ہے کہ ان کے رہوار قلم سے جو بھی تحریر میں آیا ہے وہ ان کے لیے آخرت میں ز اور راہ بن جائے اور اللہ کے سامنے پیش ہوتے وقت ان کے لیے سامان نجات بن جائے اور یقیناً اللہ تعالیٰ ہر نیکی کو یاد رکھنے والے ہیں، وہی ہمارے لیے سب کچھ ہیں اور وہی ہمارا واحد سہارا ہیں۔

ہمارے محترم شیخ مخالفین کے ساتھ برتاؤ میں عدل و انصاف کے قائل تھے، پر سکون مکالمات اور موضوع کی حدود میں رہنے کی بنا پر شہرت حاصل کی، مجھے بعض ممالک میں منعقدہ علمی حلقوں میں اس کتاب کو پڑھانے کی کئی دفعہ سعادت حاصل ہوئی، اور مجھے اندازہ ہوا کہ نہ صرف مبلغین بلکہ اہل علم نے بھی اس کتاب کے مندرجات کو پسند کیا کہ جنہیں اگر موجودہ حالات پر منطبق کیا جائے تو اختلاف اور فرقہ بندی کے بادل چھٹ سکتے ہیں۔

رابطہ عالم اسلامی کی قائم کردہ، ”عالمی تنظیم علماء مسلمین“ کے اغراض و مقاصد کے مطابق اور مسلمانوں کی صفوں کی شیرازہ بندی کی خاطر، یہ تنظیم اس کتاب کو لباس نو میں شائع کرنے کا ارادہ کر رہی ہے تاکہ خیر و فضل کی بات عام ہو سکے۔ میں، ”عالمی تنظیم علماء مسلمین“ کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے اس کتاب کے آغاز یہ چند تمہیدی سطور تحریر کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں اور اس طرح شیخ کی نیکی اور نیک کام میں سبقت لے جانے کا اعتراف بھی ہو جائے گا، ورنہ میں کیا اور میری حیثیت کیا، عمرو بن العلاء نے کیا خوب کہا: پچھلوں کے مقابلے میں ہم ایسے ہی ہیں جیسے سبزیوں کے چند خوشے کھجور کے سرو قد درخت کی جڑ میں۔“

میں اللہ جل و علا کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ مؤلف کتاب پر اپنی رحمت نازل فرمائیں 'جنت کے فردوس بریں میں انہیں مقام عطا فرمائیں اور اس کتاب کو ان کے درجات کی بلندی کے لیے صدقہ جاریہ بنادیں اور مسلمانوں کو کلمہ حق پر جمع ہونے کی توفیق عطا فرمائیں 'انہیں آپس کی خانہ جنگی سے محفوظ رکھیں اور تمام فتنوں سے بھی امن میں رکھیں چاہے وہ ظاہری فتنے ہوں یا باطنی اور میں اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ وہ علماء کو حق بات بیان کرنے 'جماعت کو قائم رکھنے 'صفوں کو یکجا رکھنے اور اختلافات کو ختم کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

و صلی اللہ تعالیٰ علی نبینا محمد و علی آلہ و صحبہ اجمعین والحمد لله رب العلمین
ڈاکٹر سعد بن علی الشمرانی
عالمی تنظیم علماء مسلمین

مقدمہ اشاعت اول

الحمد لله رب العلمين والصلاة والسلام على رسولہ الامين وعلى آله وصحبه اجمعين وبعد

اُمت اسلام ان دنوں تاریخ کے خطرناک ترین دور سے گزر رہی ہے کہ جس سے پہلے کبھی سابقہ پیش نہیں آیا اس مرحلے پر یہ باتیں نمایاں ہیں:

(۱) اُمت ہر پہلو سے کمزور و ناتواں ہے، اس میں عقیدہ، سیاست، اقتصادی حالت، اجتماعی اخلاقی اور سلوک انسانی کے تمام پہلو شامل ہیں۔

(۲) اُمت کئی چھوٹے چھوٹے ملکوں میں اس طرح تقسیم ہو چکی ہے کہ ہر علاقے کا اپنا لیڈر اپنی زمین اپنی سیاست اور اپنے مقاصد ہیں۔

(۳) ہر ملک میں لوگ فرقوں اور پارٹیوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔

(۴) دشمن اس اُمت کے عقیدے اور اس کے سرمایہ حیات و زر و مال کو نشانہ ہدف بنائے ہوئے ہیں۔

(۵) معاشرے کے اندر سے کچھ لوگ دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔

(۶) دینی مسائل کے بارے میں غلط مفہوم کو پھیلا نا چاہتے ہیں۔

(۷) دشمنان اسلام امت کو اندرونی طور پر لڑانا چاہتے ہیں۔

(۸) اسی طرح میڈیا اور سیاحت کے توسط سے امت کی صفوں میں رذیل عادات رائج کرنا چاہتے ہیں۔

(۹) عوام کو حکام کے خلاف بھڑکاتے ہیں اور حکام پر اپنے عوام کو قعر مذلت میں رکھنے پر دباؤ ڈالتے ہیں۔

(۱۰) معاشرے کے تمام طبقات میں بغاوت کے جراثیم پھیلاتے ہیں، کہانی یہ گھڑی جاتی ہے کہ ظلم ہو رہا ہے اور حقوق مارے جا رہے ہیں یہاں تک کہ بیٹا باپ کے خلاف اور بیوی شوہر کے خلاف گھڑی ہو جاتی ہے۔

(۱۱) ہر معاشرے میں مختلف فرقوں اور جماعتوں کو کھڑا کیا جاتا ہے۔

ان تمام منفی اور مضر عوامل کے ہوتے ہوئے اُمت کے ہوشمند افراد کا فرض بنتا ہے کہ وہ حالات کا بغور مطالعہ کریں تاکہ اُمت کی مشکلات کا مناسب حل نکل سکے یا کم از کم ان کے منفی

اثرات میں کمی ہو سکے۔ ان تمام منفی پہلوؤں میں سب سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ اُمت اختلافات کا شکار ہے اور اس کا اظہار علماء ’مبلغین‘ حکام کے اختلاف اور اُمت میں مختلف فرقوں اور جماعتوں کی کثرت اور ان کے اختلاف رائے سے ہوتا ہے۔ اور آج کے دور میں جبکہ مختلف فرقوں اور جماعتوں کے درمیان محسوس رکاوٹیں دور ہو چکی ہیں ’اور مختلف مذاہب اور ان کے عقائد آمنے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں‘ اس بات کی ضرورت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ ایسی حالت کا مقابلہ کیسے کیا جاسکے۔ ماضی میں مخالف کے ساتھ ذرا فاصلے پر رہ کر بات کی جاتی تھی لیکن اب تو مخالفین اکثر جگہوں پر اور اکثر وسائل نشر و اشاعت میں ایک دوسرے کے سامنے خم ٹھونکے نظر آتے ہیں۔ اب کہاں مخالف کے ساتھ کچھ واسطوں کے ذریعہ بات کرنا اور کہاں یہ کہ اس کے ساتھ بلا کسی واسطہ کے مقابلہ کیا جائے! اور پھر کہاں وہ اختلاف جو کتابوں کے صفحات تک ہو اور کہاں وہ جو حقیقی طور پر موجود ہو۔ اور کہاں وہ اختلاف کہ جو صرف دو پارٹیوں تک محدود ہو اور کہاں وہ کہ جسے آپس میں لڑائی کرانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ آج دشمنان اسلام پردے کے پیچھے سے ہر اسلامی گروہ کو مدد پہنچا رہے ہیں تاکہ دوسرے گروہ کی ٹھکانائی ہو سکے ’مقصد یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ تمہارے حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے۔

ان تمام اسباب کی بنا پر ’جن میں سے کچھ کا بیان نہیں ہوا ہے‘ یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اختلافی باتوں میں ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے ہونے کے معاملے پر نظر ثانی کریں تاکہ دشمن کو ہمارے اختلافات سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔

ہمیں بہر صورت اختلافات کے باوجود امت کی وحدت کو برقرار رکھنا ہوگا ’کیونکہ ایسا ہونا ناممکن ہے کہ کوئی بھی معاشرہ اختلافات سے پاک ہو‘ بلکہ یہ کہنا بجھا ہوگا کہ کوئی ایک خاندان بھی ایسا ملنا مشکل ہے جس میں اختلافات نہ پائے جاتے ہوں بلکہ اس سے بڑھ کر ہم یہ بھی کہیں گے کہ ایسے دو افراد بھی دکھادیں جن میں اختلاف نہ پایا جاتا ہو ’یہ اور بات ہے کہ اختلاف کا حجم اور اس کی صورت کم و بیش ہو۔

اس لیے انتہائی ضروری ہے کہ وہ طریق (منہج) بالکل واضح ہو کہ جس کی روشنی میں اختلافی مسائل کا محاکمہ کیا جاسکے ’اور پھر اس منہج کا قرآن کریم ’سنت نبوی‘ اور امت کے علماء کے اقوال پر مبنی ضابطوں سے ماخوذ ہونا لازمی ہے تاکہ امت کی وحدت کی حفاظت کی جاسکے اور ان نزاعات کو رفع کیا جاسکے جو ہماری غفلت یا علاج کے طریقوں سے ہماری ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں۔

اگر منہج درست ہو گا تو بہت سارے اختلافات رفع ہو سکتے ہیں ’دلوں میں قربت پیدا ہو سکتی ہے‘ امت مضبوط ہو سکتی ہے اور داخلی اور خارجی طور پر امت کے دشمنوں کا راستہ بند کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر میں نے قرآن کریم ’سنت نبوی‘ سے چند فقہی ضابطے جمع کیے ہیں اور

انہیں مزید سمجھنے کے لیے علماء کے اقوال اور روح شریعت سے اخذ کردہ ان کے استنباطات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اور یہ اس لیے بھی کہ علماء بقول امام ابن تیمیہ کے نبی ﷺ کی منشا کو سب سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ احکام شریعت کے بیان میں اور اس ضمن میں ان کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”چونکہ شریعت کے احکامات میں سے ایسے بہت سے احکام ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے ایسے علماء کی طرف رجوع کرنا انتہائی ضروری ہو جاتا ہے جو انہیں صحیح صحیح بتا سکیں کیونکہ وہ زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کیا فرمایا تھا اور پھر ان کی مراد کیا تھی یہ علماء ہی ہیں جو لوگوں اور رسول کے درمیان وسیلے راستے اور راہنمائی کا درجہ رکھتے ہیں جو اللہ کے رسول نے ارشاد فرمایا اسے لوگوں تک پہنچاتے ہیں اپنی وسعت اور اجتہاد کی حدود میں فرامین رسول کی منشا اور غرض کو سمجھتے ہیں اور بعض دفعہ اللہ تعالیٰ ایک عالم کو وہ علم اور فہم عطا کرتے ہیں جو دوسرے کو حاصل نہیں ہوتا اور کبھی اس کے پاس ایک مسئلہ کے بارے میں وہ علم ہوتا ہے جو پہلے والے کے پاس نہیں ہوتا۔“ (۱)

اور جیسے کہ علامہ امیر صنعانی نے ارشاد فرمایا:

”ان دو باتوں میں فرق ہے وہ یہ کہ ایک عالم کی اس کے تمام اقوال میں تقلید کی جائے اور دوسری یہ کہ اس کے فہم سے استفادہ کیا جائے۔ پہلی بات کتاب و سنت کے دلائل سے قطع نظر کرتے ہوئے اس کے قول کو لینا ہے اور دوسری بات کہ اس کے فہم سے استفادہ کیا جائے ایسے ہی ہے جیسے راستہ جاننے کے لیے ایک رہنما لیا جائے یا وہ شخص جو راستے میں کھو گیا ہو وہ کسی ماہر گائیڈ کی خدمات حاصل کرے گویا دلیل کی طرف پہنچنے کے لیے ایک اور دلیل (راہنما) کا سہارا لیا جائے۔“ (۲)

میں نے اس کتاب کا عنوان رکھا ہے: ”الضوابط الفقہیۃ للتعامل مع المخالف فی المسائل الاصلیۃ والفرعیۃ“ (اصلی اور فرعی مسائل میں مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے کے فقہی ضابطے۔)

میں نے یہاں لفظ ”فقہی“ استعمال کیا ہے نہ کہ ”شرعی“ کیونکہ فقہ کی نسبت صاحب کتاب کی طرف کی گئی ہے جس کا مطلب ہے ”سمجھنا“ یعنی موکلف کتاب یا تحقیقی مقالے کے کاتب کا فہم جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔

”شرعی“ کی نسبت شرع کی طرف ہے جس میں غلطی قبول نہیں کی جاسکتی گویا اس کتاب کی آراء اجتہاد کا درجہ رکھتی ہیں اور اجتہاد کو لازمی طور پر پکڑنا ضروری نہیں ہے۔

”اصلی“ سے میری مراد عقیدے سے متعلق وہ مسائل ہیں جس میں ایسی کوئی نص وارد نہیں جو قطعی طور پر ثابت ہو (قطعی الثبوت) اور جس کی دلالت بھی قطعی ہو (قطعی

الدلالة) وہ اس لیے کہ دین میں دلائل کے چار مراتب ہیں:

(۱) قطعی طور پر ثابت ہو اور اس کی دلالت بھی قطعی ہو۔

(۲) قطعی طور پر ثابت ہو لیکن اس کی دلالت ظنی ہو۔

(۳) ظنی طور پر ثابت ہو اور اس کی دلالت بھی ظنی ہو۔

(۴) ظنی طور پر ثابت ہو لیکن اس کی دلالت قطعی ہو۔

جہاں تک پہلی قسم کا تعلق ہے تو اس کتاب کے موضوع میں وہ داخل نہیں ہے۔ یعنی ایسی دلیل جس کے الفاظ ثابت ہوں اور اس کا معنی و مطلب اتنا واضح ہو کہ جس سے اہل علم کے درمیان اختلاف رفع ہو جائے اس قسم میں کسی کے لیے اختلاف کی گنجائش نہیں۔ باقی تینوں اقسام اس کتاب کے موضوع سے متعلق ہیں۔ (۳)

اور اللہ کا شکر ہے کہ امت میں دین کے اصولی مسائل جن کو اہل سنت کے نزدیک ارکان کا نام دیا گیا ہے کوئی اختلاف پایا نہیں جاتا یہ وہ مسائل ہیں جو حدیث جبرائیل میں مذکور ہیں۔ اگر انہیں اختلاف ہوا ہے تو ان مسائل میں جو ارکان کی جزئیات سے متعلق ہیں اور یہ قطعاً مناسب نہیں کہ انہیں فتنہ پھیلانے اور مخالف کو ایذا پہنچانے کے لیے استعمال کیا جائے جبکہ مخالف نے حق جاننے کے لیے پوری پوری محنت صرف کر دی تھی لیکن حق تک پہنچنے سے محروم رہا۔ اس نے اپنی استطاعت کے مطابق بحث اور تحقیق کی جس کا اللہ تعالیٰ نے اسے مکلف قرار دیا تھا لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انسان حق تک پہنچ جائے تو اللہ عز و جل نے اپنی مخلوق کو اس کا مکلف قرار نہیں دیا اور یہ بات اس کتاب کے مطالعہ سے ان شاء اللہ واضح ہو جائے گی۔

میں اللہ سے دعا گو ہوں کہ اس کتاب سے صاحب کتاب اور قاری کتاب دونوں کو نفع پہنچے۔ بے شک وہ سننے والے ہیں اور دعا قبول کرنے والے ہیں۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد و علی آلہ وسلم

تاریخ تحریر: ۱۴۲۸/۶/۱ھ

ڈاکٹر احمد بن سعد حمدان الغامدی

قسم دراسات علیا میں عقیدے کے استاذ

ام القریٰ یونیورسٹی

حواشی

(۱) فتاویٰ امام ابن تیمیہ ۲۲۴: ۲۰۔

(۲) محمد بن اسماعیل الصنعانی، ارشاد النقاد الی تیسری الاجتہاد ص ۱۰۴

(۳) استاذ عبدالکریم النملہ اپنی قابل قدر کتاب "الجامع لمسائل اصول الفقہ و تطبیقاتها علی

المذاہب الراجح ”میں ارشاد فرماتے ہیں:

”اجتہاد صرف ظنی امور میں ہو سکتا ہے جس میں مندرجہ ذیل اقسام شامل ہیں:

(۱) نص قطعی طور پر ثابت ہو لیکن دلالت ظنی ہو جیسے قرآن کی وہ آیات اور وہ متواتر احادیث جن کے الفاظ سے ظنی طور پر حکم کا اثبات ہو رہا ہو۔

(۲) نص ظنی طور پر ثابت ہو لیکن اس کی دلالت قطعی ہو جیسے وہ اخبار آحاد جن کی دلالت قطعی ہو۔

(۳) نص کے الفاظ اور دلالت دونوں ظنی ہوں جیسے وہ اخبار آحاد جن سے ظنی طور پر حکم کا اثبات ہو۔

(۴) ایسے امور میں اجتہاد جن میں نہ نص ہو نہ اجماع۔” (صفحات ۲۹۸-۳۹۹)

مقدمہ اشاعت دوم

الحمد لله رب العلمين والصلاة والسلام على رسولہ الامين وعلى آله وصحبه اجمعين

امت مسلمہ قیادت اور رہنمائی کے لیے پیدا کی گئی ہے اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ اس کے افراد کی تعداد زیادہ ہے اور نہ اس لیے کہ انسانوں کی قیادت کے لیے اس کے پاس مادی ذرائع موجود ہیں اور نہ اس لیے کہ وہ جغرافیائی لحاظ سے ایک ممتاز علاقے کی مالک ہے اور نہ اس لیے کہ اس کے پاس دوسری امتوں کے مقابلے میں منفرد مادی وسائل موجود ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ وہ زندگی اور زندہ لوگوں کے بارے میں صحیح تصور رکھتی ہے۔ اس کائنات کے خالق اور خود اس کائنات کے بارے میں صحیح عقیدہ رکھتی ہے۔ یہ وہ واحد امت ہے جو فرد اور معاشرے کو چلانے کا صحیح نظام رکھتی ہے۔ اور یہ وہ واحد امت ہے جو زندگی کے تمام گوشوں چاہے وہ سیاسی ہوں، اقتصادی ہوں، اجتماعی ہوں یا اخلاقی، کو حرکت میں لانے کا صحیح لائحہ عمل رکھتی ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام منفرد خصوصیات رکھنے کے باوجود جس حالت میں وہ جی رہی ہے وہ ان تمام خصوصیات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ صحیح طریقے سے اپنی زندگی میں ان عظیم الشان خزانوں سے استفادہ نہیں کر پارہی ہے۔ ان تمام خصوصیات سے استفادہ کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ کیا ہے؟

نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے اختلافات، اس پر مستزاد نئے اختلافات کہ جو دین کی کج فہمی کی بنا پر ہیں اور جن کی بنا پر باہمی اخوت پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ فرقہ بندی عروج پر ہے جس کے نتیجے میں وہ ایک امت نہیں، کئی امتوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور ان میں سے ہر ایک کا اپنا فہم، اپنا سلوب اور اپنا طریق کار ہے جو دوسرے کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ اسے اپنے سے دور کرتا ہے اور بعض اوقات اسلام ہی کے نام پر اس کا خون، اس کی عزت اور اس کے مال کو بھی مباح قرار دیتا ہے اور یقیناً یہ کام ان بدترین کاموں میں سے ہے جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ان کے ضعف میں اضافہ ہوا بلکہ اللہ کے دین سے روکنے کا بھی سبب بنا۔

ہم یہ بات عمومی طور پر کر رہے ہیں گو کہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں بھلے لوگوں کی کمی نہیں ہو رہی ہے۔ لیکن بہر صورت یہ حالت ایک عارضی بیماری کی طرح ہے جو اللہ کے اذن سے زائل ہونے والی ہے کیونکہ ہم ہر جانب سے حالات کو درست کرنے کی پکار سن رہے ہیں اس لیے امید ہے کہ اس کے مثبت اثرات ظاہر ہوں گے اور صحیح اور رہنمائی کے اس عمل میں حصہ لینا ان بہترین نیکیوں میں سے ہے جن سے اللہ عز و جل کا تقرب حاصل کیا جاسکتا ہے۔

میں نے یہ کتاب اسی غرض سے تحریر کی ہے تاکہ وہ اس عمارت کی ایک اینٹ بن سکے جو تصحیح افکار کے لیے کھڑی کی جا رہی ہے اور جس کے قائم کرنے کے لیے اہل ایمان ہر جگہ نذا لگا رہے ہیں۔ پھر بھی ہمیں یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ تصحیح کا یہ عمل مضبوط بنیادوں اور درست ضابطوں کا مرہون منت ہونا چاہیے کہ جو کتاب اللہ 'سنت نبوی علیہ السلام اور ان دونوں مصادر کے صحیح فہم پر قائم ہوں و گرنہ جن ثمرات کی امید کی جا رہی ہے وہ حاصل نہ پائیں گے۔

اور میں اللہ عزوجل سے امید کرتا ہوں کہ میری یہ کتاب انہی مضبوط بنیادوں پر استوار رہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کتاب کی پہلی اشاعت نے مسلم ممالک کے اہل علم میں قبول عام پایا۔ میں نے اپنی تحریر میں اختصار سے کام لیا ہے لیکن اس طرح کہ تشنگی نہ باقی رہے کیونکہ کثرت کلام اور پھر قاعدوں اور فروعات کی بھرمار گو فائدے سے خالی نہیں ہوتی لیکن قاری کو الجھا کے رکھ دیتی ہے اور پراگندگی فکر کا باعث بنتی ہے۔

میں نے اس اشاعت میں چار نئے ضابطے رقم کیے ہیں جن کا اس کتاب میں شامل کیا جانا فائدے سے خالی نہیں 'یہ تیسیس (۲۳) سے چھبیس (۲۶) تک والے ضابطے ہیں۔ کہیں کہیں میں نے ضوابط کی ترتیب میں بھی تبدیلی کی ہے اور بعض عبارتوں کو بھی نکھارا ہے۔ (۱)

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اس محنت کو نفع بخش بنائیں۔ بے شک وہ سننے والے ہیں اور قبول کرنے والے ہیں اور ہمارے نبی محمد اور ان کی آل اور ان کے اصحاب پر صلاۃ و سلام ہو۔

تحریر: ۱۲: ۱ : ۱۴۳۱ھ

حاشیہ

(۱) اب یہ چوتھی اشاعت آپ کے ہاتھ میں ہے جس میں چوتھے ضابطے کو دسویں میں سمودیا گیا ہے۔

تمہید

عصر حاضر کے لوگوں کی زندگی میں ایسے بہت سے حالات اور واقعات پیش آرہے ہیں جن میں شریعت کی خاص نصوص وارد نہیں ہوتیں، گو شریعت کی عمومی نصوص یا ان کا مفہوم سے مسائل کا احاطہ کرتا نظر آتا ہے لیکن اسے صرف اللہ سے تعلق رکھنے والے علماء ہی پہچان سکتے ہیں۔ عصر حاضر کے ان حوادث کی چھان بین کرنے والے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ نصوص شرعیہ کی روشنی میں اپنے فہم کے مطابق کوئی بھی حکم لگاتے وقت علماء و ربانین کے فہم سے بھی بھرپور استفادہ کرتا رہے تاکہ اس کا اپنا فہم ان کے فہم کے دائرہ سے باہر نہ نکل سکے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک باحث کو سلف کے ذخیرہ کتب میں غواصی کرنا ہوگی تاکہ نصوص شرعیہ کے بارے میں ان تحقیقین علماء کے فہم کا پہلے ادراک کیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ اس کا اپنا فہم کہاں تک ان کے فہم سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے فہم کو قبول کرنے یا ٹھکرا دینے کا فیصلہ کر سکتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نئے نئے مسائل میں ہمارے قدیم علماء کا ایسا کلام ملنا بڑا مشکل ہے جو نصوص شرعیہ کے سمجھنے میں اور ہمارے اپنے فہم کی تصحیح کرنے میں مدد دے سکے۔

ہاں علماء نے ایسی بہت سی شرحیں لکھی ہیں جو نصوص کی تشریح کرتی ہیں اور ان کے زمانے میں پائے جانے والے حالات و واقعات پر دلالت بھی کرتی ہیں لیکن ان کا عصر حاضر کے حالات و واقعات پر انطباق کرنا ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے اس لیے بہر صورت اس بات کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ قابل قدر اور ثقہ اہل علم سے اس باب میں مدد لی جاتی رہے۔ محققین علماء کے کلام کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کچھ حضرات نے نصوص کا تعلق زندگی میں پیش آنے والے نئے واقعات سے قائم کرنے میں کثرت سے کلام کیا ہے اور کچھ نے سرسری انداز سے بات کی ہے جو بہر صورت ہمارے لیے مفید رہی ہے، لیکن ان تمام اہل علم میں ایک قد آور شخصیت نظر آتی ہے جس نے معاشرے کے حالات کو نصوص شرعیہ کی روشنی میں پرکھنے کی ایسی کوشش کی ہے کہ کوئی بھی مسئلہ اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو وہ کوئی قاعدہ کوئی حل یا وہ قابل تقلید مثال پیش کرتے نظر آئیں گے۔

یہ شخصیت ہیں امام اور محقق شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ۔ ان کی اس امتیازی شخصیت کے پیچھے وہ حالات ہیں جو زندگی میں انہیں پیش آئے، ہم وہ نمایاں پہلو پیش کرنے کی کوشش کریں گے جن کی وجہ سے وہ اپنے معاصر علماء میں فائق نظر آتے ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا کلام کیوں نمایاں ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ علم کے بحر بے کنار ہیں شریعت کے اکثر علوم پر حاوی ہیں

جس فن پر بھی بات کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف اسی فن کے ماہر ہیں اور یہ قدرتی بات ہے کیونکہ ہر شخص محدود عمر کے ہوتے ہوئے ہر فن کا ادراک نہیں کر سکتا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی عنایت خاص سے نوازا تو وہ اس نمایاں حیثیت کو پہنچے۔ ابن دقیق العید کہتے ہیں:

”سارے علوم ان کی آنکھوں کے سامنے ہیں، وہ جو چاہتے ہیں اخذ کرتے ہیں اور جو چاہتے ہیں

چھوڑتے جاتے ہیں۔“ (۱)

قرآن مجید کو لے لیں، کوئی بھی مسئلہ ہو وہ اپنے بے نظیر حافظے اور قرآن کے اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے کی وجہ سے اس سے متعلق آیات کو بلا تکلف پیش کرتے چلے جائیں گے۔ فن تفسیر کو دیکھ لیں، اگر کسی آیت کے معانی و مطالب کو بیان کرنے پر آئیں تو بڑے اہتمام سے ایسے ایسے نکات پیش کریں گے کہ انسان تعجب کیے بغیر نہ رہے گا۔ مثال دیکھنی ہو تو قرآن کی چھوٹی سورتوں کی تفسیر دیکھیں، خاص طور پر سورۃ الاخلاص اور سورۃ الاعلیٰ کی تفسیر دیکھیں، وہ معانی و مطالب کے ایسے ایسے موتی لٹائیں گے کہ قاری دنگ رہ جائے۔

ابن تیمیہ کے ایک معاصر عالم البرزانی (ف ۷۳۹ھ) ارشاد فرماتے ہیں: (۲)

”ان کے پائے کا کوئی عالم نہ تھا، مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے، مجتہد ہونے کی ساری شرطیں ان میں پائی جاتی تھیں، جب تفسیر بیان کرتے تو لوگ حیران رہ جاتے۔ وہ اس لیے کہ وہ ہر قول کے بارے میں بیان کرتے کہ کیا رائج ہے، کیا ضعیف ہے اور کیا غلط ہے، اور اس پر مستزاد ان کی یادداشت میں روانی تھی، اور ادائیگی بر موقع تھی۔“ (۳)

پھر علم حدیث کو لے لیجیے، اگر کسی مسئلہ میں کسی قول کو رائج قرار دیا ہے تو اس بارے میں تمام احادیث بیان کریں گے اور یہ بھی بتائیں گے کہ ان کی تخریج کیا ہے، حدیث کا صحت اور ضعف اور اسانید کے اعتبار سے کیا درجہ ہے۔ الذہبی (ف ۷۴۸ھ) کہتے ہیں:

”جن دنوں وہ اسکندریہ میں قید تھے، والی سند نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی مروی احادیث کا انہیں اجازت نامہ عطا فرمائیں اور ان میں سے کچھ کا ذکر بھی کر دیں تو انہوں نے اپنی یاد سے دس اور اق پر مشتمل احادیث مع اسانید تحریر کر دیں، اور یہ ایسا کام ہے کہ ایک بڑے سے بڑے محدث کے لیے بھی ایسا کرنا مشکل ہو گا۔ امام صاحب کو حدیث سے متعلق تمام علوم میں مہارت حاصل تھی جیسے فن رجال حدیث، ان کے بارے میں جرح و تعدیل کے کلمات، ان کے طبقات، حدیث کے دیگر فنون جیسے عالی اور سافل اور صحیح اور ضعیف درجے کی احادیث اور پھر ان کا زبانی یاد رکھنا، معاصر علماء میں سے کوئی بھی ان کے درجہ تک پہنچتا نظر نہیں آتا، اور جس طریقے سے وہ ان احادیث کو زبان کی نوک پر رکھے نظر آتے ہیں اور پھر ان سے دلائل اخذ کرتے ہیں وہ انتہائی اچنبھے کی بات معلوم ہوتی ہے اور پھر یہ کہ وہ کتب ستہ اور مسند امام احمد کا حوالہ دے کر بتائیں گے کہ یہ احادیث کہاں کہاں پائی جاتی ہیں، اسی لیے یہ کہنا درست ہو گا کہ

جس حدیث کو ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث نہیں ہے، بہر حال علم کلی کا احاطہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں، ہاں اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جہاں دوسرے علماء پانی کی کھاڑیوں سے چلو بھرتے نظر آتے ہیں تو وہ براہ راست سمندر سے دودھ ہاتھ کرتے نظر آتے ہیں۔” (۴)

ابن کثیر (ف ۷۷۷ھ) ارشاد فرماتے ہیں:

”علم حدیث کے وہ علمبردار ہیں، حافظ حدیث ہیں، صحیح اور کمزور حدیث کو خوب جانتے ہیں“

رجال حدیث کا بھرپور علم رکھتے ہیں۔” (۵)

اور جہاں تک فقہ کا تعلق ہے تو ان کے فتاویٰ پڑھنے والا خوب جانتا ہے کہ انہیں مختلف مذاہب کی آراء کے بیان کرنے اور پھر ان میں ترجیح دینے کا کتنا بڑا ملکہ حاصل ہے۔ البرزالی ارشاد فرماتے ہیں:

”فقہ اور صحابہ و تابعین کے مذاہب اور مذاہب اربعہ کے نقل کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔“

(۶)

اور جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے تو جہاں جہاں انہوں نے لغوی چھان بین کی ہے تو لغت میں بھی ان کی کمال مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ اور رہے مذاہب، ادیان، فلسفہ اور تاریخ کا علم تو ان کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان علوم میں کوئی بھی ان کا ہم پلہ نہیں۔

البرزالی، امام ذہبی کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

”تفسیر کی معرفت میں وہ حرف آخر ہیں، حدیث کے رجال، صحیح اور ضعیف کی معرفت میں وہ مرجع ہیں، مذاہب اربعہ کے علاوہ صحابہ اور تابعین کے مذاہب کا حوالہ دینے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ علم کلام، اصول اور فرق و مذاہب کی معرفت میں بھی ان کا کوئی مثیل نہیں، لغت اور زبان کے اسرار و رموز کا خوب علم رکھتے ہیں، سیرت و تاریخ کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہیں، عملی میدان میں ان کی شجاعت، علم جہاد کا بلند کرنا بیان سے باہر ہے، جو دستخوات میں ان کی مثالیں بیان کی جاتی ہیں، لیکن کھانے پینے اور رہنے سہنے میں زہد و قناعت کی تصویر ہیں۔“ (۷)

دوم: اپنے زمانے کے لوگوں کے حالات سے باخبر تھے، لوگ نہ صرف ان کے قریب تھے بلکہ ان پر کامل بھروسہ رکھتے تھے، ہر جگہ سے لوگ ان سے سوالات کرتے تھے، وہ اس لیے کہ وہ لوگوں کو پیش آنے والے تمام مسائل کو بخوبی جانتے تھے اور مناسب حال فتویٰ دیا کرتے تھے اور پھر ایسے عملی قاعدے بھی بتاتے تھے کہ جس سے وہ پیش آمدہ حالات اور نئے نئے مسائل کا حل تلاش کر سکیں۔

ابن فضل اللہ العمری (۷۴۹ھ) ابن ناصر الدمشقی کے حوالے سے ابن تیمیہ کے حالات

زندگی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

”فتاویٰ ان کی طرف کھینچے چلے آتے تھے، وہ ان کی طرف نہیں جاتے تھے اور جب ان سے فتویٰ پوچھا جاتا تو وہ ایسے ایسے جواب دیتے گویا وہ اس کے انتظار میں بیٹھے تھے:

أَبْدًا عَلَى طَرَفِ اللِّسَانِ جَوَابُهُ فَكَانَتْهَا هِيَ دَفْعَةً مِنْ صَيِّبٍ
 “زبان کی نوک پر جواب دھرا رہتا ہے گویا موسلا دھار بارش برس رہی ہے۔” (۸)

ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی آنکھوں سے لوگوں کی مشکلات ’ان کے باہمی تنازعوں اور اختلافات کو دیکھا اور اسی لیے ان کے فتاویٰ اور ارشادات نئے آمدہ مسائل اور لوگوں کے حالات کے مطابق ہوا کرتے تھے اور اگر ان کا ہمارے زمانے کے جدید مسائل سے مقابلہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاص طور پر ایک حد تک ہمارے ہی مسائل کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔

عصر حاضر کے جدید مسائل کے بارے میں بحث و تحقیق کرنے والا ابن تیمیہؒ کے فتاویٰ اور ارشادات میں وہ کچھ پاتا ہے جو اس گہرائی سے اور اس کثرت سے کسی ایک عالم کے پاس شاید ہی ملے۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ ایک عالم کے پاس نہیں بلکہ متعدد علماء کے پاس یہی باتیں جزئی طور پر یا بکھری ہوئی پائی جائیں اور اس مقصد کے لیے کافی زیادہ بحث و تحقیق کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کی طرف خود ہی ان الفاظ سے اشارہ کیا ہے:

“اللہ تعالیٰ ایک عالم کو اس علم اور فہم سے نوازتے ہیں جو دوسرے کو حاصل نہیں ہوتی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دوسرے شخص کے پاس ان مسائل کا علم ہو جو پہلے والے کے پاس نہ ہو۔” (۹)

سوم: ابن تیمیہ کے کلام میں جو ٹھہراؤ اور گہرائی پائی جاتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے عالم کی مانند ہیں جو دین پر فخر کرتا ہو ان در آمدہ مناجح کو خوب پرکھنا جانتا ہو جنہوں نے بہت سے علماء کلام (بمعنی عقائد) کو بھی اس طرح دھوکہ دیا ہے کہ وہ انہیں شرعی مناجح سے خلط ملط کر چکے ہیں اور اس بنا پر یہ کہنا درست ہو گا کہ انہیں فہم کی درستی اور مناجح کی پاکیزگی کا افتخار حاصل ہے اور اس لیے ان کے فتاویٰ اور ارشادات کی ایک الگ شان نظر آتی ہے۔

ان کی یہی امتیازی خصوصیات ہیں جنہوں نے میرے علاوہ ہزار ہا دوسرے محققین کو اپنی طرف کھینچا ہے اور وہ ان قواعد و ضوابط پر بھروسہ رکھتے ہیں جو انہوں نے سلف صالح کے فہم کے مطابق شرعی دلائل سے اخذ کیے ہیں۔

ہم نے اختصار سے یہ تنبیہ کرنا ضروری سمجھا تا کہ قاری کو اندازہ ہو سکے کہ ہم نے اس عظیم محقق کے اقوال کو کئی دوسرے علماء کی طرح اس کثرت سے کیوں پیش کیا ہے کتاب میں دیے گئے حوالوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی رہے گی۔

حواشی

(۱) جلاء العینین فی محاکمة الاحمدین ص ۶۔

(۲) الذہبی اپنے معاصر البرزالی کے بارے میں کہتے ہیں: ”وہ امام ہیں، حافظ ہیں، بات کو عمدگی سے پیش کرنے والے ہیں، صادق اور حجت ہیں، ہمارے استاد، رفیق اور مربی ہیں، ارض شام کے محدث، ہمارے زمانے کے مورخ اور اساتذہ کے سرخیل ہیں۔“ (م ۲۔ ورقۃ ۲۵)

(۳) الشهادة الزكية از مرعي بن يوسف الكرمي -

(۴) ايضاً (۴۸) -

(۵) البداية والنهاية ۱۲: ۱۳۷ -

(۶) ابن البهادي نے ”العقود الدرية في مناقب شيخ الاسلام احمد بن تيمية“ (۳۹) میں اس کا ذکر کیا۔

(۷) الرد الوافر از ابن ناصر الدين الدمشقي (۳۳) -

(۹) الفتاوى ۲۲۲: ۲۰ -

نیت کا درست کرنا واجب ہے

ہر اس عمل سے پہلے جس سے اللہ کا تقرب حاصل کرنا مقصود ہو، نیت کا درست کرنا مشروع ہے۔ بروایت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) (۱)

”اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔“

مخالفین کے ساتھ بات چیت کرنا اور ان کی تردید کرنا نیکی کے اعمال میں سے ایک عمل ہے، اس لیے بات چیت کرنے والے یا تردید کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ارادہ صرف غلطی کی تصحیح کرنا اور صحیح بات بتانا ہو، یہ مقصد نہ ہو کہ مخالفین کو بدنام کیا جائے یا ان کے عیب نکالے جائیں یا اپنے آپ کو نمایاں کرنے یا شہرت حاصل کرنے کا ارادہ ہو، ایسا کرنے سے نہ صرف یہ کہ دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے بلکہ یہ شخص گناہگار بھی ہوتا ہے اور اس گناہ کے نتیجے میں اس کا عمل رائیگاں بھی چلا جاسکتا ہے۔ اسی لیے بات چیت کرنے والے یا تردید کرنے والے کے لیے خالص نیت کا ہونا ضروری ہے تاکہ شیطان کو دخل اندازی کا موقع نہ مل سکے۔ اور جو شخص اس بات کی ہمت نہ رکھتا ہو تو بہتر ہے کہ وہ اس قسم کی بات چیت میں سرے سے داخل ہی نہ ہو تاکہ اس کے پاکیزہ عقیدے اور اخلاص نیت کی حفاظت ہو سکے۔

”حق کے بیان میں کیا غیبت کرنا جائز ہے؟“ اس سوال کے جواب میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

”جو شخص علم سے مسلح ہو کر اس میدان میں اترتا ہے تو اس کے لیے حسن نیت ضروری ہے اگر وہ حق کی بات بھی کرتا ہے لیکن اس کا ارادہ زمین میں بڑائی حاصل کرنا یا فساد پھیلانا ہے تو وہ اس شخص کی مانند ہے جو عصبیت اور ریاکاری کی بنا پر قتال کرتا ہے اور اگر وہ صرف اللہ عز و جل کی خاطر اور دین خالص کی نیت سے بات کرتا ہے تو وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں اور انبیاء و رسل کے وارثین میں سے شمار ہوگا۔“ (۲)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اس موذی مرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو جگہ جگہ مشرکین کی طرف سے دی گئی ایذاؤں پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے حالانکہ وہ ان سب لوگوں کے امام ہیں جو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں، اس لیے ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دے اور صرف یہ ارادہ رکھے کہ مجھے اللہ کے حکم کی پابندی کرنا ہے، مخالف کی اصلاح کرنی ہے یا اس پر حجت قائم کرنا ہے۔ لیکن اگر مقصود یہ

ہو کہ اپنے لیے یا اپنے گروہ کے لیے سرداری حاصل ہو جائے اور دوسرے کا عیب ثابت ہو جائے تو یہ وہ عصبیت ہے جسے اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے اور اسی طرح اگر ناموری یا ریکاری کے لیے کام کیا جائے تو یہ عمل رائیگاں چلا جائے گا۔

پھر اگر لوگ اس کا جواب دینے لگیں یا اسے ایذا پہنچائیں یا یہ کہیں کہ یہ خود غلط ہے اور اس کی غرض بھی فاسد ہے اور پھر اس کے نفس میں بدلہ لینے کی خواہش جنم لے اور شیطان اس پر غالب آجائے تو گو آغاز میں وہ اللہ ہی کی خاطر اٹھا تھا لیکن پھر بر بنائے خواہش اپنے مخالفین اور ایذا پہنچانے والوں پر غالب آنے کا ارادہ قوی ہو گیا اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ ان پر زیادتی کرنے کا بھی مرتکب ہو جائے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ مختلف آراء رکھنے والے اپنے آپ کو صحیح سمجھتے ہیں اور یہ کہ وہی حق پر ہیں اور سنت کے حامل ہیں ان میں سے اکثر ایسے لوگ ہیں جو اپنی ذاتی وجاہت ریاست اور اپنے سے منسوب خیالات کی کامیابی کی خواہش رکھتے ہیں ان کا یہ قصد نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو اور سارا کارا دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے اپنے مخالف پر غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں چاہے وہ اپنے اجتہاد میں عذر رکھتا ہو کہ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس سے ناراض نہ ہوں اور یہ لوگ ان لوگوں سے راضی رہتے ہیں جو ان کے ہمنوا ہوں چاہے وہ نرے جاہل ہوں بد ارادہ ہوں نہ صاحب علم ہوں نہ اچھا قصد رکھتے ہوں اور متبجنا وہ اس کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں جس کی مذمت نہ اللہ نے کی اور نہ اس کے رسول نے اور وہ اس کی مذمت کرتے ہیں جس کی مذمت نہ اللہ نے کی اور نہ اس کے رسول نے ان کی ساری دوستی اور دشمنی اللہ کے دین اور اللہ کے رسول کے گرد نہیں بلکہ اپنی خواہشات کے گرد گھومتی ہے۔ ” (۳)

امام غزالیؒ ایسے شخص کو جس کی نیت فاسد ہو کہتے ہیں:

”وہ یہ زعم رکھتا ہے کہ وہ تو صرف مخلوق کی اصلاح چاہتا ہے اور اگر اس کے ساتھیوں میں سے کوئی ایسے ابھر کر آئے کہ وہ مرجع خلافت بن جائے اور اس کے ہاتھ پر لوگوں کی اصلاح ہو، تو حسد اور غم اسے کھا جائیں۔ اور اگر اس کا اپنا کوئی زائر اس کے کسی ساتھی کی تعریف کر دے تو لوگوں میں وہ مبغوض ترین ٹھہرے۔“ (۴)

اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ نہیں چاہتا کہ کسی اور کے ہاتھ پر دین کی کامیابی ظاہر ہو کیونکہ وہ اندر ہی اندر اپنے لیے ریاست اور بڑائی چاہتا تھا نہ کہ دین کی کامیابی اور بڑائی یہ وہ مرض ہے جو پوشیدہ شہوت کے زمرے میں آتا ہے اور اس میں وہ لوگ مبتلا رہتے ہیں جو شہرت اور ناموری چاہتے ہیں۔ ہمیں اللہ اس سے معاف رکھے۔

نیت کے فاسد ہونے کے بارے میں علماء نے اس انداز سے تنبیہ کی ہے کہ اکثر لوگ اس کا خیال نہیں کر پاتے اور معلوم ہونا چاہیے کہ اگر شہرت یا ناموری کا قصد ہو یا ایک گروہ کا دوسرے گروہ پر اور ایک شیخ کا دوسرے شیخ پر غلبے کا قصد ہو یا ایک شخص کی عیب جوئی صرف اس

لیے روار کھی جائے کہ وہ مخالفین میں سے ہے یا اس کے اپنے گروہ میں سے ہے، تو نہ صرف مخالفوں کی تردید کرنے والے کا عمل رائیگاں چلا جاتا ہے بلکہ وہ گنہگار بھی ہوتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ سے ظلم کا ارتکاب ہوا ہے جو کہ قطعاً حرام ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اپنے دوست کی غلطی اور حق سے دوری کے باوجود اس کے بارے میں کچھ نہ کہنا اور مخالف کی نیکی اور علم کے باوجود اس کی غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا انسان کے عمل کو رائیگاں بنا دیتا ہے اور اسے اللہ کے ہاں مستوجب سزا ٹھہرا دیتا ہے۔ اور جس شخص کو منکر کے انکار یا غلطی کی تصحیح پر ایذا پہنچے تو اسے صبر کرنا چاہیے، معاملہ کو اتنا نہ بڑھانا چاہیے کہ مخالف پر زیادتی کی جائے، اسے ناکردہ اقوال کا سزاوار ٹھہرایا جائے، اور اس کی زیادتیوں کی وجہ سے اس کی غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ مخالف اس مسئلہ میں حق کو نہ جانتا ہو اور دوسروں کو غلط سمجھ کر ان پر رد کر رہا ہو، اور اپنے اس اجتہاد کی بنا پر اجر کا مستحق ہو لیکن جو شخص تمام حدود کو پامال کرتا ہو اس کی تردید کرے تو اس کے گنہگار ہونے میں کوئی شک نہیں اور خاص طور پر جبکہ وہ خود بھی جانتا ہو کہ وہ زیادتی کر رہا ہے۔

حواشی

(۱) بخاری (۱) مسلم (۳۶۸۵) - مسلم کی حدیث میں، "بِالْبَيِّنَةِ" کا لفظ ہے۔

(۲) مجموع الفتاویٰ ۲۸: ۲۳۵۔

(۳) منهاج السنہ النبویہ ۵: ۲۵۴-۲۵۵۔

(۴) احیاء علوم الدین ۳: ۳۶۹۔

اپنے نفس کو پاک کھلانے سے بچنا

اگر آپ کا اپنے کسی ساتھی سے کسی نص کے سمجھنے میں یا کسی مسئلہ کے حکم میں اختلاف ہو جائے تو آپ کو کبھی بھی یہ اعتقاد نہیں رکھنا چاہیے کہ آپ پوری طرح بات کہہ رہے ہیں کہ جس میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں اور یہ کہ آپ کا مخالف پوری طرح کہ جس میں درستگی کا کوئی احتمال نہیں یہ نظریہ نہ صرف ظلم پر مبنی ہے بلکہ اب آپ کے نفس آپ کے فہم یا جس کی آپ تقلید کر رہے ہیں اس کے فہم کا تزکیہ پایا جائے اور صحیح بات یہی ہے کہ آپ اپنے فہم یا فیصلے میں غلطی کا تصور بہت امکان تسلیم کر کے اور اپنے مخالف کے فہم یا فیصلے میں تھوڑی بہت درستگی کی نسبت نا خیال رکھیں کیونکہ آپ کے پاس ایسی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ آپ ہی درست ہیں اور آپ کا مخالف۔ اور اس طرح باہمی بات چیت کا دروازہ کھل سکتا ہے اور دو مختلف آراء رکھنے میں فاصلے قریب کیے جاسکتے ہیں اور ان کے درمیان غرور اور تکبر کا بت توڑا جاسکتا ہے۔

“الاشباہ والنظائر” کے شارح لکھتے ہیں:

فائدہ: المصنفی کے آخر میں ارشاد فرمایا: اگر فروغ میں ہمارے مذہب اور ہمارے مخالف کے بارے میں ہم سے پوچھا جائے تو ہمارے لیے یہ کہنا واجب ہے کہ ہمارا مذہب صحیح ہے لیکن غلطی کا احتمال رکھتا ہے اور ہمارے مخالف کا مذہب غلط ہے لیکن صحت کا احتمال رکھتا ہے وہ اس لیے کہ اگر آپ قطعی طور پر اپنے تئیں درست سمجھیں تو پھر یہ کہنا تو درست ہے کہ مجتہد غلطی بھی کر سکتا ہے اور صحیح بھی ہو سکتا ہے اور اگر ہم سے ہمارے عقائد مخالف کے عقائد کے بارے میں پوچھا جائے تو پھر یہ کہنا واجب ہے کہ ہم جو کہہ رہے ہیں وہ اور ہمارے مخالف جو عقیدہ رکھتے ہیں وہ باطل ہے اور مشائخ سے اسی طرح منقول یہ وہ رائے ہے جو متکلمین کے ہاں پائی جاتی ہے کہ فروغ میں تو ایک دوسرے کے عذر کو تسلیم کیا جائے لیکن عقائد یا اصولی باتوں میں نہیں لیکن یہ چیز سلف کے مذہب کے خلاف ہے جو ہر غلطی میں عذر کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ اللہ عزوجل نے جب ہمیں یہ کہنا سکھایا: **اَرَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِينَا اَوْ اَخْطَاْنَا** (البقرة: ۲۸۶) ”اے ہمارے رب ہم سے پوچھ گچھ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں“۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”میں نے ایسا ہی کر دیا“۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

”اور اصولی مسائل اور صفات باری تعالیٰ، تقدیر اور امامت وغیرہ سے متعلق مسائل کہ جن میں اہل علم کا اختلاف ہوا ہے اسی قبیل میں سے ہیں کہ یہاں ایسے مجتہد بھی ہیں جو صحیح ہیں اور ایسے

جو غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غلطی کرنے والا زیادتی کر رہا ہو اور ایسے زیادتی کرنے والے بھی ہیں جو بغیر اجتہاد ایسا کر رہے ہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں کہ جہاں دیا گیا ہے وہاں صبر کا دامن ان سے چھوٹ جاتا ہے۔ ” (۲)

آئندہ بیان کردہ ضابطوں میں ان شاء اللہ مزید تفصیل آتی رہے گی اور جو شخص فروع میں عذر کو تسلیم کرتا ہے تو اسے دوسری غلطیوں میں بھی عذر کو تسلیم کرنا چاہیے اور وہ اس لیے کہ شریعت نے دونوں باتوں میں فرق نہیں کیا ہے۔

حواشی

(۱) غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر ۷: ۲۶۳۔

(۲) الاستقامة ۱: ۳۷۔

حق کو قبول کرنے پر نفس کو آمادہ کیے رہنا

جب کبھی دینی مسائل میں سے کسی مسئلہ کے حکم کے بارے میں یا کسی نص کے سمجھنے میں اختلاف واقع ہو جائے اور ایک شخص اپنے ساتھی سے فہم میں اختلاف کرے یا اس رائے کو ترجیح دے جو دوسرے کے نزدیک مرجوح ہے تو پھر چار صورتیں ہو سکتی ہیں اور یہاں پانچویں کا کوئی احتمال نہیں، یا تو دونوں غلطی پر ہوں یا دونوں درست رائے رکھتے ہوں۔ یا ایک غلطی پر ہو اور دوسرا درست ہو یا یہ کہ ان دونوں میں سے ایک ایک لحاظ سے درست ہو اور ایک لحاظ سے غلط ہو۔ برباہ احتمال کہ دونوں درست ہوں تو اہل سنت والجماعت کے اعتبار سے ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ حقیقت میں ہر مسئلہ کا ایک ہی حکم ہو سکتا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ دو آدمی اختلاف کریں اور دونوں ہی درست ہوں، باقی تینوں صورتیں واقع ہو سکتی ہیں۔ یعنی دونوں اگر مسئلہ کی چھان بین کریں اور ایک شخص کی رائے کی صحت ظاہر ہو جائے تو دوسرے شخص کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس راجح رائے کو قبول کرے اور اپنے فہم اور اپنی رائے کو چھوڑ دے اور پہلے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے بھائی میں نقص نکال کر ایسی باتیں نہ کرے کہ وہ حق قبول کرنے پر تہدد نہ ہو، ایک انسان چونکہ دوسرے شخص کے فہم اور اس کی دلیلوں سے واقف نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنے آپ کو درست سمجھتا ہے چونکہ وہ صرف اپنے دلائل کی روشنی میں بات کر رہا ہوتا ہے مین جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو اس کے لیے لازم ہے کہ اپنی غلطی سے باز آئے اور یہ وہ مرتبہ ہے کہ کم ہی لوگ یہاں تک پہنچتے ہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ حاتم الاصحم کے حوالہ سے کہتے ہیں:

”میں تین خصلتوں کا مالک ہوں کہ جن سے میں اپنے مخالف پر غالب آتا ہوں۔ وہ یہ کہ اگر وہ درست ثابت ہو جائے تو میں خوش ہوتا ہوں اور اگر وہ غلطی کرے تو میں غمگین ہوتا ہوں اور اس کے ساتھ جہالت سے پیش آنے سے اپنے نفس کو روکے رکھتا ہوں، یہ بات امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تک پہنچی تو انہوں نے کہا: سبحان اللہ! کیا عقل کی بات کہی ہے!“

اس کے بعد امام غزالی اپنے زمانے کے بیمار دل والوں کے بارے میں کہتے ہیں:

”اپنے زمانہ کے مناظرہ کرنے والوں کو دیکھو، اگر اس کے مخالف کی زبان پر حق جاری ہو جائے تو ان کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور پھر ان کی ندامت کو دیکھو اور کیسے کیسے جہاں تک ہو سکے وہ اس کا

انکار کیے چلے جاتے ہیں اور ساری عمر اس کی مذمت کیے رہتے ہیں۔”

پھر ایک مناظرہ کے لیے یہ شرط رکھتے ہیں کہ :

“حق کی طلب میں اسے ایسا ہونا چاہیے جیسا ایک کھوئی ہوئی چیز کا تلاش کرنے والا ہوتا ہے اس کے نزدیک اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ گمشدہ چیز اسے ملے یا اس کے کسی مددگار کو وہ اپنے ساتھی کو مخالف نہیں بلکہ مددگار سمجھتا ہے اور اس کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے غلطی کا احساس دلایا اور اس کے سامنے حق کو ظاہر کر دیا۔” (۱)

مشہور عالم العز بن عبد السلام اپنے زمانے کے لوگوں کے تعصب اور اپنے مخالفین کی زبان پر ظاہر ہونے والے حق کی عدم پیروی پر تعجب کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں :

“اس کا ہمارے اسلاف کے مناظروں سے کیا مقابلہ !! جو مسائل کی تحقیق میں مشورہ کرتے اور اس حق کو تسلیم کرنے میں کوئی دیر نہ لگاتے جو مخالفین کی زبان پر ظاہر ہو جاتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے جب کبھی کسی سے مناظرہ کیا تو دل میں یہ کہا: اے اللہ! اس کے دل میں اور اس کی زبان پر حق جاری کر دے اگر حق میرے ساتھ ہو تو وہ میری بات مان لے اور اگر حق اس کے ساتھ ہو تو میں اس کی بات مان لوں۔” (۲)

یہ ہے وہ ایمان پر ور روح کہ اگر ہو تو حقیقت واضح ہو جائے دلوں میں الفت پیدا ہو جائے فتنہ و فساد کے دروازے بند ہو جائیں اور امت کی صفوں میں اتحاد و یگانگت کا دور دورہ ہو۔

حواشی

(۱) احیاء علوم الدین ۱: ۶۴۔

(۲) قواعد الاحکام ۲: ۱۳۶۔

اختلاف کو ایسے سمجھنا کہ وہ لوگوں کے درمیان ایک طبعی امر ہے

لوگوں کے درمیان فہم کے اختلاف اور مسائل کی پہچان میں اونچ نیچ چلی آتی ہے یہ ایک قدرتی بات ہے اور اس کا بالکل ختم ہو جانا ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً ۚ وَلَا يَذْكُرُونَ فَتْلِفِينَ ﴿١١٨﴾ إِلَّا مَنْ رَزَحَمَ رَبُّكَ ۖ وَبِذَلِكَ خَلَقَهُمْ ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١١٩﴾ {

(ہود: ۱۱۸-۱۱۹)

”اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی راہ پر ایک امت بنا دیتا وہ تو برابر مختلف ہی رہیں گے سوائے ان کے جن پر اللہ رحم فرمائے اور انہیں تو اسی لیے پیدا کیا ہے اور آپ کے رب کی یہ بات پوری ہے کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے پُر کر دوں گا۔“
اور اسی کے مطابق کہا گیا کہ اللہ عز و جل نے لوگوں کو اختلاف کے لیے پیدا کیا گویا یہ تقدیر کے متن مقاصد میں سے ہے کہ جن سے مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ظاہر ہوتی ہے۔ ابن القیم ارشاد فرماتے ہیں:

”لوگوں کے درمیان اختلاف کا واقعہ ہونا ضروری ہے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں وہ اس لیے کہ ان کی سمجھ اور ادراک میں فرق پایا جاتا ہے جو چیز قابل مذمت ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں۔ اگر اس طرح سے ہو کہ دوری اور فرقہ بندی نہ پیدا ہو اور اختلاف کرنے والوں کا ارادہ صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہو تو پھر یہ اختلاف ضرور رساں نہیں ہو گا کہ ایسا ہونا انسان کی جبلت میں داخل ہے اور اگر بنیاد ایک ہو مقصد بھی ایک ہو اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی ایک ہو تو شاید ہی اختلاف واقع ہو اور اگر واقع ہو بھی جائے تو صحابہ کے مابین اختلاف کی مانند یہ اختلاف نقصان نہ پہنچائے گا کیونکہ ان کی بنیاد ایک تھی اور وہ ہے اللہ کی کتاب اور سنت رسول ﷺ ارادہ بھی ان کا ایک

زبان

جائے

تھا یعنی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت راستہ بھی ایک تھا یعنی کتاب و سنت کے دلائل کو پیش نظر رکھنا اور انہیں ہر قول ہر رائے ہر قیاس ہر مزاج اور ہر سیاست پر فوقیت دینا۔ (۱)

شاطبی ارشاد فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اس ملت کے فروعی مسائل فکر و نظر اور ظن و تخمین کی جولان گاہ رہیں گے، اہل علم کے ہاں یہ بات طے ہے کہ عام طور پر نظریاتی امور میں اتفاق نہیں پایا جاتا، کیونکہ ظنی امور میں اختلاف کا امکان پایا جائے گا لیکن یہ صرف فروع میں ہو گا نہ کہ اصول میں، جزئیات تک محدود رہے گا نہ کہ کلیات تک، اور اسی لیے وہ ضرور رساں ہو گا۔“ (۲)

شاطبی رحمہ اللہ کی یہ رائے نصف اول میں تو سلف کے مذہب کے مطابق ہے لیکن نصف ثانی میں متکلمین کے مذہب کی ہم نوا ہے کیونکہ متکلمین فروع کی غلطی میں تو ایک دوسرے کو معذور سمجھتے ہیں لیکن جسے اصول یا عقائد کہا جاتا ہے اس میں اختلاف ہونے پر ایک دوسرے کو معذور نہیں سمجھتے لیکن مذہب سلف کے ماننے والے دونوں صورتوں میں معذور سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اصل اور فرع میں فرق نہیں پایا جاتا اور نہ ہی ظنی اور قطعی ہیں، ایسی تقسیم ان کے ہاں نہیں پائی جاتی تھی، وہ اس لیے کہ ظنی اور قطعی کی تقسیم لوگوں کے ہاں نسبتاً پائی جاتی ہے، یعنی اگر ایک شخص کسی بات کو قطعی سمجھتا ہے تو دوسرا اسے ظنی قرار دیتا ہے، اور اگر ایک اسے ظنی سمجھتا ہے تو دوسرا اسے قطعی قرار دیتا ہے، اور یوں ظنی و قطعی کا دعویٰ کرنا کسی قاعدے کا پابند نہیں رہتا اور اسی لیے احکام کا دار و مدار اس پر نہیں ہو سکتا کیونکہ احکام کا دار و مدار ایسے امور پر ہوتا ہے جو کسی قاعدے کے پابند ہوں۔

حواشی

(۱) الصواعق، ۲: ۵۱۹۔

(۲) الاعتصام، ۲: ۱۶۸۔

لوگوں کی ذہنی صلاحیتوں کا خیال رکھنا

بعض علمی مسائل صاف اور واضح ہوتے ہیں اور بعض پوشیدہ اور مستور، اسی طرح عقلی مسائل میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ نصوص کی تعبیر کیسے کی جائے اور مسائل پر کیسے حکم لگایا جائے یہ بات چونکہ بشر کی طبیعت میں پائی جاتی ہے اس لیے اس کا خیال کرنا نہایت ضروری ہے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مختلف صورتوں میں پیدا کیا ہے ان کی صلاحیتوں اور فہم میں اختلاف رکھا ہے جس سے بنا پر ان سب کو کسی ایک فہم یا ایک صلاحیت کے تابع کرنا مشکل ہے اس لیے ہمیں اختلاف کو قبول کرنا ہوگا لیکن حجت اور مناظرے کے ساتھ نہ کہ کسی قوتِ قاہرہ کے ساتھ انہیں کم کرنے اور ان کی شدت میں تخفیف کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

”ہر وہ شخص جو اجتہاد کرتا ہو استدلال کی قوت رکھتا ہو حق جاننے کی طاقت نہیں رکھتا اور وعید (عذاب الہی) صرف اس شخص کے لیے ہے جس نے کسی امر کو چھوڑا ہو یا کسی نہی کا ارتکاب کیا ہو“

یہی ائمہ کرام اور فقہاء کا قول ہے اور یہی اس امت کے اسلاف سے منقول ہے اور یہی جمہور مسلمین کا قول ہے۔“ (۱)

نفسی پر ہونے والے مجتہد کے بارے میں وہ ارشاد فرماتے ہیں:

”جو شخص بھی دلائل کا صحت نظر سے جائزہ لیتا ہے کیا ضروری ہے کہ وہ ان کے نتائج سے پوری طرح فائدہ حاصل کر سکے کچھ لوگ علی الاطلاق انہیں قبول کر لیتے ہیں اور کچھ قطعی اور ظنی دلائل میں فرق روا رکھتے ہیں یعنی وہ ان لوگوں کے ہمنوا ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ظنی دلائل حقیقی دلائل نہیں ہیں۔ لیکن درست بات یہ ہے کہ دلائل کو پرکھنے کے بعد اعتقاد کا حصول عقلوں کے تفاوت کی بنا پر مختلف ہوتا ہے کہ وہ کہاں تک صفاف اور شفاف ہیں کہاں تک ذہانت اور پاکیزگی رکھتی ہیں اور کہاں رکاوٹ تھی اور کہاں نہ تھی پھر جو علم حاصل ہو گا وہ دو امر پر مبنی ہوگا۔

وہ دلائل کیا تھے اور استدلال کی نوعیت کیا تھی؟ جسمانی قویٰ کی مانند استدلال قوت میں بھی اختلاف ہوتا ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی دلیل کو جب ایک ذہین و فطین شخص دیکھتا ہے تو اسے یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے اور جب اسے کم عقل والا دیکھتا ہے تو یقین کیا اسے تو سرے سے وہ دلیل ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ حساب اور جیومیٹری کو دیکھ لو کہ ان کے نتائج یقینی ہوتے ہیں لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ کچھ لوگ ان کو بھی نہیں سمجھ پاتے۔ ان کا دلائل کے نتائج کو نہ سمجھنا بعض دفعہ غم عقلی یا پیدا کنشی کمزوری کی بنا پر ہوتا ہے اور بعض دفعہ اس لیے بھی کہ اس نے ایسے مسائل کی مشق نہیں کی ہوتی اور نہ ہی وہ ان میں دیکھنے کا عادی ہوتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص کسی چیز

کو اٹھا نہیں پاتا یا تو جسمانی کمزوری کی بنا پر اور یا اس لیے کہ وہ اس کو اٹھانے کا گر نہیں جانتا یا یہ کہ وہ اسے اٹھانے کا عادی نہیں رہا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شدید محنت و مشقت کے بعد ایک چیز کا ادراک حاصل کر سکے لیکن اللہ نے اسے اس کا مکلف نہیں ٹھہرایا ہے جیسے مریض کے نماز کے قیام کے لیے مکلف نہیں ہے بعض دفعہ اسے مشقت کے بعد ہی ادراک ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ مکلف باقی رہتا ہے جیسے جہاد کا وجوب ہے کہ اس میں اپنے نفس کی ہلاکت کا خوف باقی رہتا ہے پھر بھی اسے جہاد کرنا پڑتا ہے اور بعض دفعہ بلا مشقت ہی اسے ادراک حاصل ہو جاتا ہے لیکن وہ شخص اتنے دوسرے واجب کاموں میں گھرا ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے فارغ نہیں ہو سکتا یا اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس میں غور و فکر کر سکے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل میں ایسے اعتقاد کا الٹ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح طریقے سے اس مسئلہ کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔” (۲)

اس منہج کو راضی کرنے کے لیے ہم ابن تیمیہ کی مثال دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مخالفین کے ساتھ کیا موقف اختیار کیا۔

ابن تیمیہ نے الرازی کے اوپر اپنی دو کتابوں میں جو ان کی جلیل القدر کتابوں میں شمار ہوتی ہیں خوب رد کیا ہے بلکہ ان کی اکثر کتابوں میں اس کا ذکر ہوتا ہے اور پھر اس کی تردید ہوتی ہے وہ ایک جگہ اس کا کلام ذکر کرنے کے بعد اس کا رد کرتے ہیں اور پھر اسے معذور ٹھہراتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

”باطل فکر کی نصرت کے لیے اس نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا ہے بلکہ اپنی فکر و تحقیق کے مطابق اس نے وہی کچھ کہا جو عقلی دلائل کہہ رہے ہیں وہ اگر معقولات میں اپنی فکر و نظر کے مطابق فلسفہ کے خلاف کوئی چیز دیکھتے ہیں تو اس سے فلاسفہ کا رد کرتے ہیں ان کا کام ہے کہ اپنی رائے کے مطابق بحث کرنا اگر انہیں کوئی چیز مخالفین کے کلام کی تردید میں نظر آتی ہے تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے ہیں اور یہ سلوک سب کے ساتھ یکساں ہیں کچھ لوگ اس سے بدظنی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر باطل کلام پیش کرتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے علم اپنے فکر و نظر اور اپنی تحقیق کے مطابق جو بھی ظاہر ہوتا ہے اسے پیش کرتے ہیں۔”

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

”اگر ایک شخص کوتاہی کی انتہاء تک پہنچا ہوا ہو اور اس کے ذائل کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کی یہ کوتاہی (یا عجز) اللہ کے ہاں عذر بن جائے گی کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو سزا نہیں دیتے جو پوری طرح اجتہاد کرنے کے بعد کلام کرے۔” (۳)

مندرجہ بالا حوالے سے معلوم ہوا کہ لوگوں میں انفرادی سطح پر فرق پایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں نصوص کے سمجھنے اور مسائل پر حکم لگانے میں بھی فرق واقع ہوا ہے اور یہ بات تقاضا کرتی ہے کہ مخالفین سے مناظرہ کرنے والا شخص ان فروق کا لحاظ کرے اور ان کے مطابق ہی دوسروں سے معاملہ کرے نہ یہ کہ ان کو سرے سے خاطر ہی میں نہ لائے اور پھر اس حقیقت کو

خبر کرنے کے لیے جو مخالف پر واضح نہیں ہو سکی ہے، اپنی استطاعت کے مطابق نرمی سے کام لے اور خاص طور پر ان دقیق مسائل میں جو مقدمات کے اور گہری معرفت کے محتاج ہوتے ہیں تاکہ لوگوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جاسکے۔

حواشی

(۱) الفتاویٰ، ۲۰۹:۴۔ (۲) الفتاویٰ، ۳۱۳:۹۔ (۳) الفتاویٰ، ۵۶۱:۵-۵۶۳۔

نفین

ہوتی

ہے

وئے

س کے

تقاضا

بق ہی

نت کو

حالات اور معاشرے کا خیال رکھنا

چین سے لے کر اندلس تک عالم اسلامی ایک بہت بڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور اس اعتبار سے طرح طرح کے معاشروں نے بھی جنم لیا ہے اور نتیجتاً اجتہاد اور استنباط کے طریقوں میں بھی اختلاف واقع ہوا ہے جن کی وجہ سے بہت سی نصوص اور بہت سے نئے مسائل کے سمجھنے میں بھی اختلاف دیکھا گیا ہے لیکن اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ دین کے اصول اور ارکان میں اختلاف نہیں پیدا ہوا۔

امت کا ارکان اسلام پر اجماع قائم ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی ﷺ کی رسالت کا اقرار اور نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے، رمضان کے روزے رکھنے اور بیت اللہ کا حج کرنے پر کلی اعتقاد اور اسی طرح ارکان دین پر بھی اجماع ہے یعنی اللہ پر اس کے فرشتوں اور رسولوں پر اس کی کتابوں پر، یوم آخرت اور تقدیر پر ایمان رکھنا۔

تعبیر چیزوں میں اختلاف کا معاملہ اتنا سنگین نہیں ہے۔ ابن تیمیہ ارشاد فرماتے ہیں:

”مسلمان چاہے سنی ہوں یا بدعتی اللہ اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اس کے رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان کے وجوب پر متفق ہیں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج پر بھی ان کا اتفاق ہے اور اس بات پر بھی کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا اور اسے عذاب نہیں ہوگا اور یہ کہ جو شخص محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے اور ایسے ہی ان سے مماثل وہ امور جو دین کے اصول و مبادی اور ایمان کے قواعد میں داخل ہیں اور جن کا اسلام اور ایمان سے انتساب رکھنے والے اقرار کرتے ہیں اور اس کے بعد وہ چند امور جن کا تعلق و عید سے ہے یا بعض اصطلاحات کے معنی و مطلب سے ہے تو وہ متفقہ امور کے مقابلے میں اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے البتہ کتاب و سنت پر مبنی کھلے اور روشن حق کی مخالفت کرنے والے جمہور امت کے نزدیک بدعتی کہلاتے ہیں ان کی گمراہی پر مہر شہادت لگ چکی ہے امت میں ان کا کوئی سچا گواہ نہیں اور نہ ہی انہیں قبول عام حاصل ہے اور ہماری مراد ہے جیسے خوارج، روافض اور قدر کا انکار کرنے والے اور ان کی قبیل کے دوسرے لوگ اور جہاں تک اہل علم و صحابہ سنت کے درمیان اختلاف ہوا ہے تو وہ چند دقیق امور میں ہوا ہے جو اکثر لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں لیکن اصل اصول یہی ہے کہ جس بات میں بھی تنازعہ ہوا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دیا جائے۔“ (۱)

اس لیے اگر ایک شخص مسلمانوں کے کسی معاشرے میں جاتا ہے اور وہاں اسے ایسے مسائل سے سابقہ پڑتا ہے جنہیں وہ نہیں جانتا تھا یا ان سے مانوس نہیں تھا جیسے جبری نماز میں بسم

نہ کا آہستہ سے پڑھنا یا بلند آواز سے پڑھنا یا طاق رکعات میں جلسہ استراحت کرنا یا نہ کرنا یا آخری تشہد میں توڑک کر کے بیٹھنا یا نہ بیٹھنا یعنی ایسے مسائل کہ اہل علم میں ان کے بارے میں اختلاف ہوا ہے تو ایسے شخص کو ان مسائل پر تکلیف کرنے سے پہلے تھوڑا انتظار کرنا چاہیے تاکہ اصل مسئلہ ظاہر ہو جائے کیونکہ بعض ایسے بھی مسائل ہیں کہ جن میں لوگوں کے حالات اور معاملات کے تنوع کے اعتبار سے اختلاف کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے اور اگر اسے فتویٰ دینا بھی پڑے تو اسے احتیاط و معاملات کے اختلاف کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ شوکانی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

”اللہ کی حجت کو قائم کرنے کے لیے میں تمہیں وہ راستہ دکھاتا ہوں جس سے تمہیں مدد ملے گی اور وہ یہ کہ تم اچانک لوگوں پر داخل ہو اور پھر ان کو ڈانٹنا اور دھتکارنا شروع کر دو جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس پر ماتم کرنا شروع کر دو اور جن باتوں سے وہ مانوس ہیں انہیں فوراً ہی چھوڑ دینے کا مطالبہ کرو بلکہ اپنے مطالبے پر اڑ جاؤ نہیں! بلکہ ان کے ساتھ وہ راستہ اپناؤ کہ جو وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو دلوں کو اللہ تعالیٰ کے دیے گئے احکام کی طرف جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں انہیں رغبت دلاؤ کہ شریعت کی پابندی کا کیا بڑا ثواب ہے اور ایسے ہی رائے کے مقابلہ میں دلیل کو پکڑنے اور باطل کے مقابلے میں حق کو قبول کرنے کا کیا عظیم درجہ ہے۔“ (۲)

قرآنی ایک معاشرے میں عادات کے اختلاف اور اس کی بنا پر باہمی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”زمانے بھر میں فتوے کا یہی چلن ہے کہ عرف چاہے وہ نیا کیوں نہ ہو اس کا خیال رکھو اور اگر وہ نہ رہے تو پھر اسے ساقط کر دو جو کچھ کتابوں میں منقول ہے کبھی بھی ساری عمر اس پر جمو نہ کرنا۔ بلکہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے علاقے سے آکر تم سے فتویٰ طلب کرے تو فتویٰ دیتے وقت اپنے علاقے کے عرف کا مت اعتبار کرنا بلکہ اس کے اپنے علاقے کے عرف کے بارے میں پوچھ کر اسی کے اعتبار سے فتویٰ دینا اور کتابوں میں مذکور اقوال کا لحاظ مت رکھنا یہی حق بین ہے اور منقولات پر جمو دیکے رہنا دین میں گمراہی ہے اور علماء سلف اور علماء مسلمین کے مقاصد سے ناواقفی ہے۔“ (۳)

بن القیم القرافی کے اس قول کو ذکر کرنے کے بعد یوں تبصرہ کرتے ہیں:

”یہی اصل فقہ ہے اور جو شخص صرف کتابوں میں منقول اقوال پر لوگوں کو فتویٰ دیتا ہے اور اس اختلاف کا خیال نہیں رکھتا جو ان کے اعراف عادات زمان و مکان اور حالات و قرآن میں پایا جاتا ہے تو وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی گمراہ کرتا ہے ایسا شخص دین کے معاملہ میں اس طبیب سے بڑا مجرم ہے جو مریضوں کے لیے صرف کتابوں سے دیکھ دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے اور اس اختلاف کا خیال نہیں رکھتا جو ان کے علاقوں ان کی عادات ان کے زمانے اور ان کی طبیعتوں میں پایا جاتا ہے۔ ایسا طبیب اور ایسا مفتی دونوں کے دونوں جاہل ہیں لوگوں کے بدن اور لوگوں کے دین سے کھیلے ہیں۔ پس اللہ ہی مددگار ہے۔“ (۴)

ایک اور جگہ پر ابن القیم ارشاد فرماتے ہیں:

“ایک مفتی اور حاکم حق کے مطابق اسی وقت فتویٰ دے سکتا ہے جب کہ دو طرح کی سمجھ رکھتا ہو پہلی بات یہ ہے کہ وہ واقعہ کو سمجھتا ہو اور تمام قرآن اور علامات کو دیکھ کر جو بھی واقع ہو اس کی حقیقت کا ادراک رکھتا ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اس واقعہ پر لگنے والے حکم کی سمجھ رکھتا ہو۔ یعنی اس قسم کے واقعہ میں اللہ کی کتاب سے اور سنت رسول سے کیا حکم سمجھا جاسکتا ہے۔ پھر ایک کا دوسرے پر انطباق کرے ایسا شخص اس عمل میں اگر پوری محنت صرف کرے اور اپنی استطاعت کے مطابق تمام امور کا احاطہ کرے تو ایک اجر یا ہرے اجر سے محروم نہ ہوگا صحیح عالم وہی ہے جو واقعہ کی پوری تفصیلات سے آگاہ ہو کر پہلے اسے سمجھتا ہے اور پھر اللہ اور اس کے رسول کے حکم تک پہنچ پاتا ہے۔ (۵)

ابن القیم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

“یہاں سمجھ کے دو پہلو ہیں جو ایک حاکم کے لیے انتہائی ضروری ہیں: عمومی طور پر تمام واقعات کے احکام کی سمجھ رکھنا اور دوسرے یہ کہ نفس واقعہ اور لوگوں کے حالات کی سمجھ رکھنا کہ جس سے سچے اور جھوٹے اور حق و باطل کے درمیان امتیاز ہو سکے پھر وہ دونوں باتوں میں تطبیق دے سکے اور پھر اس واقعے پر جو بھی حکم واجب ہوتا ہے لگائے اور اس کا یہ حکم واقعے کے خلاف نہ جاتا ہو۔” (۶)

امام ابن القیم نے اپنی کتاب ”اعلام الموقعین عن رب العالمین“ میں زمان و مکان کے اختلاف کی بنا پر فتوے کے مختلف ہونے کے بارے میں پورا ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے: “عادات نیات احوال اور زمان و مکان کے بدلنے کی بنا پر فتوے کا بدلتے رہنا” پھر وہ کہتے ہیں:

“یہ بات انتہائی سود مند ہے اور اس سے ناواقفیت کی بنا پر شریعت سے بہت سی غلط باتیں منسوب ہو جاتی ہیں اور جس کی وجہ سے لوگ حرج اور مشقت میں پڑ جاتے ہیں اور ایسی باتوں کے مکلف قرار دیے جاتے ہیں جن کا کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ شریعت جو اعلیٰ ترین مصالح پر مبنی ہے وہ ان چیزوں کی کیسے اجازت دے سکتی ہے اس لیے کہ شریعت ان حکمتوں اور مصالح پر استوار ہوئی ہے جو لوگوں کی معیشت اور ان کے مستقبل دونوں کے لیے مفید ہیں۔” (۷)

اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ پچھلے زمانوں میں صادر ہونے والے اکثر فتاویٰ عصر حاضر کے قابل نہیں ہیں اس لیے کہ حالات اور مواقع بدل چکے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ جب عراق سے نکل کر مصر میں آئے تو انہیں ایسے حالات سے سابقہ پیش آیا جو عراق میں دیکھنے میں نہیں آئے تھے اس لیے انہوں نے حالات اور جگہ کی تبدیلی کی بنا پر اپنے فتاویٰ میں بھی تبدیلی کی اور اپنے مذہب میں بھی اصلاح کی اور اس طرح ان کے بارے میں کہا گیا کہ ان کے دو مذہب یعنی ایک قدیم اور ایک جدید ہیں۔ اور اس لیے مخالفین سے بات چیت کرتے وقت لوگوں کے حالات اور

جمادات کا خیال رکھنا چاہیے اور مثال کے طور پر آج مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے جو چیز مناسب ہے وہ مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے مناسب نہ ہو۔
خواتین

(۱) الفتاویٰ ۲: ۱۳۰۔

(۲) أدب الطلب ومنتہی الأرب ص ۵۶۔

(۳) أنوار البروق فی انواء الفروق ۲: ۲۲۹۔

(۴) اعلام الموقعین ۳: ۲۵۴۔

(۵) الطرق الحکمیة ۱: ۱۳۱۔

(۶) اعلام الموقعین ۲: ۴۲۵۔

(۷) ایضاً

اجتہاد پر مبنی مسائل کا انکار نہیں کیا جاسکتا

الایہ کہ وہ نص صریح کے مخالف ہوں

فقہ اسلامی کے موضوع پر موجود کتابوں میں ایسے سینکڑوں مسائل ہیں جس میں علماء نے اختلاف کیا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ صاحب فتویٰ کے فہم پر مبنی اجتہاد اس مسئلہ میں دیے گئے حکم کے باعث ہوتا ہے۔ اس لیے اگر یہ اجتہاد کسی صریح دلیل کے مخالف نہ ہو تو اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا کیونکہ ایک مجتہد کے قول کو دوسرے مجتہد کے قول سے زیادہ صحیح قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ وہ اس لیے کہ غلطی سے معصوم ذات صرف نبی ﷺ کی ہی ہے۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں:

”اگر ایک مسئلہ میں نہ ہی کوئی سنت منقول ہو اور نہ ہی اجماع اور وہاں اجتہاد کی گنجائش ہو تو اس پر عمل کرنے والے پر انکار نہیں کیا جاسکتا چاہے وہ مجتہد ہو یا مقلد ہو۔“ (۱)

ابن تیمیہ اہل سنت اور اہل بدعت دونوں کے طریقوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”اصولی مسائل ہوں یا فروعی امت کی صفوں میں جن مسائل میں اختلاف واقع ہوا ہے اگر انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف نہ لوٹایا جائے اس وقت تک حق واضح نہیں ہوتا بلکہ اختلاف کرنے والے بغیر دلیل کے جھگڑتے نظر آتے ہیں اگر اللہ کی رحمت ان کے ساتھ شامل حال ہو تو وہ ایک دوسرے کا لحاظ رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بعض اجتہادی مسائل میں لوگوں کا حال تھا وہ ایک دوسرے کو مانتے تھے اور ان پر زیادتی نہیں کرتے تھے اور اگر اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہو تو ان کے درمیان مذمت کے قابل اختلاف واقع ہو جاتا ہے اور پھر ایک دوسرے پر زیادتی کرتے نظر آتے ہیں چاہے وہ قول سے ہو یعنی کسی کو کافریا فاسق قرار دینا یا فعل سے ہو جیسے اسے مارنا قتل کرنا یا جیل میں ڈال دینا۔ اہل بدعت جیسے خوارج وغیرہ کا یہی حال رہا ہے یہ لوگ دین کے مسائل میں اتنے جھگڑاؤ ہو جاتے ہیں کہ امت پر ظلم کرتے ہیں اور زیادتی کرتے ہیں ایسے ہی تمام بدعتیوں کا حال ہے ایک تو بدعت ایجاد کرتے ہیں اور پھر جو بھی اس کی مخالفت کرے اسے کافر قرار دیتے ہیں ووافض معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ کا یہی حال ہے جن لوگوں نے خلق قرآن کا مسئلہ بنا کر لوگوں کا امتحان لیا تھا وہ ایسے ہی لوگ تھے خود ہی ایک بدعت ایجاد کی اور پھر جس نے اس کی مخالفت کی اسے جھٹ سے کافر قرار دے دیا اور پھر اسے نہ صرف اس کے حقوق سے محروم کیا بلکہ اسے سزا بھی دلائی۔

اللہ کے رسول ﷺ جن باتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں ان میں سے کچھ باتیں جن لوگوں پر مخفی رہ جاتی ہیں وہ یا تو عادل ہوں گے یا ظالم ان میں انصاف پسند وہ لوگ ہیں جو انبیاء سے منقول آثار پر عمل کرتے ہیں لیکن دوسروں پر ظلم نہیں کرتے اور ان میں ظالم وہ لوگ ہیں جو دوسروں پر زیادتی کرتے ہیں اور یہ لوگ جانتے ہیں کہ وہ ظلم کر رہے ہیں پھر بھی وہ ظلم کرتے رہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا تَفْقَرُ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَةُ﴾ (البیئہ: ۴) اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی وہ دلیل آنے کے بعد ہی جدا جدا ہو گئے۔ لیکن اگر وہ عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرتے تو ایک دوسرے کا اقرار کرتے جیسے ائمہ فقہاء کے پیروکار جو یہ جانتے ہیں کہ وہ ان اختلافی مسائل میں بطور خود اللہ اور اس کے رسول کا حکم جاننے سے قاصر ہیں تو انہوں نے اپنے ائمہ کو رسول کے نائب کی حیثیت سے جانا اور کہا کہ ہماری ساری کی ساری پہنچ یہاں تک ہے ان میں سے انصاف پسند لوگ دوسروں پر ظلم و زیادتی نہیں کرتے نہ ہی قول سے اور نہ ہی فعل سے جیسے یوں کہنا چاہیے کہ میرے امام کا قول ہی صحیح ہے چاہے وہ حجت سے خالی ہو اور اپنے مخالف کی مذمت کرنا حالانکہ وہ اپنا عذر رکھتا ہو۔ (۲)

ابن حنفیہ اپنی کتاب الفروع میں کہتے ہیں:

”ابن الجوزی نے اپنی کتاب ”السر المصون“ میں لکھا ہے کہ میں نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جو علم سے انتساب رکھتے ہیں لیکن ان کا طرز عمل عوام الناس جیسا ہے اگر کوئی حنبلی شوافع کی مسجد میں نماز پڑھاتے ہوئے، بسم اللہ ”بلند آواز سے نہ پڑھے تو شوافع ناراض ہو جاتے ہیں اور اگر ایک شافعی حنابلہ کی مسجد میں نماز پڑھائے اور بسم اللہ بلند آواز سے پڑھے تو حنابلہ ناراض ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ ایک خالص اجتہادی مسئلہ ہے اور اس پر اصرار کرنا ہوائے نفس میں داخل ہے کہ جس سے منع کیا گیا ہے۔“

ابن عقیل کہتے ہیں: میں نے لوگوں کو دیکھا ہے کہ اگر وہ عاجز نہ ہوں تو ظلم پر اتر آئیں اور میں عوام کی بات نہیں کر رہا بلکہ علماء کا ذکر کر رہا ہوں۔

ابن یوسف کے عہد میں حنابلہ کو کھلی چھٹی تھی چنانچہ وہ فروعی مسائل میں شوافع پر زیادتی کرتے تھے اور شوافع کو قنوت پڑھنے اور بسم اللہ کو جہر سے پڑھنے سے روکتے تھے حالانکہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا اور پھر جب ابن یوسف وفات پا گئے اور نظام کی حکومت آگئی اور حنابلہ کے دن ہوا ہو گئے تو پھر شوافع ظالم سلاطین کی طرح ان پر چڑھ دوڑے کسی کو پابند سلاسل کیا چغلیوں کی بنا پر عوام الناس کو بھی تکلیف پہنچاتے اور فقہاء کو تجسیم کا الزام لگا کر برا بھلا کہتے۔ پھر وہ کہتے ہیں:

میں نے فریقین کے حالات کا بخوبی اندازہ لگانے کے بعد اندازہ لگایا کہ یہ لوگ آداب علم سے محروم ہیں ان کے کام ان فوجیوں سے مختلف نہیں جو اپنے دائرہ اختیار میں خوب دھاچہ کڑی کرتے ہیں اور جو نہی ملازمت سے فارغ ہوتے ہیں مسجدوں میں ڈیرہ جمالیتے ہیں۔ (آخری کلام ابن الجوزی) (۳)

حواشی

- (۱) الفتاویٰ ۹: ۱۱۳۰ -
- (۲) الفتاویٰ ۴: ۷ -
- (۳) الفروع وتصحیح الفروع ۳: ۲۳ -

اعلانیہ مناظرے سے سوائے اشد ضرورت کے اجتناب کرنا

کسی اختلافی بات میں حقیقت جاننے کے لیے باہمی بات چیت ایک درست وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اگر یہی بات چیت ایک اعلانیہ مناظرے کی شکل اختیار کر لے تو اکثر دونوں اطراف یا ان میں سے کسی ایک کو اپنے موقف پر اصرار کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور مخالف کی دلیل کی صحت کو پرکھنے کے بجائے ہر صورت اس کی تردید پر مجبور کرتی ہے اور اس لیے اس طرح کے اعلانیہ مناظرے ختم ہو جاتے ہیں لیکن کوئی بھی طرف اپنے مخالف کی بات کو نہیں مانتا بلکہ دونوں میں دوری اور کاٹ پیدا ہو جاتی ہے، اختلاف نہ صرف گہرا ہو جاتا ہے بلکہ اس کا دائرہ بھی پھیل جاتا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ ساتھیوں میں بات چیت ہو لیکن اعلانیہ نہ ہو، الا یہ کہ کسی ضروری مصلحت کی بنا پر ایسا کیا جائے۔ شوکانی کہتے ہیں:

”اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اہل علم میں سے دو انصاف پسند شخص کسی مسئلہ میں غور و خوض کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے دلائل کو پرکھتے ہیں اور یہ جاننے کے باوجود کہ حق دوسرے کے ساتھ ہے، ایک دوسرے کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں حالانکہ ان کے اپنے دلائل بالکل بے جان اور بے وزن ہوتے ہیں، تعصب کی یہ ایسی دقیق قسم ہے جس میں انصاف پسند لوگ بھی مبتلا ہو جاتے ہیں خاص طور پر اگر دوسرے لوگ بھی حاضر ہوں اور ان کی بات سنتے ہوں، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ غلط کار حق کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے، ان باتوں کا مشاہدہ اہل علم کے اجتماعات اور درس کی مجالس میں بھی بخوبی کیا جاسکتا ہے۔“ (۱)

حاشیہ

(۱) أدب الطلب، ص ۸۱۔

تردید اور تنقید میں حد سے تجاوز نہ کرنا

مخالفین کی تردید شروع اسلام سے لے کر آج تک علماء کے ہاں معروف رہی ہے اور ایسا کرنے میں قباحہ نہیں ہے۔ قباحہ ہے تو اس بات میں کہ مخالف کی دھجیاں اڑائی جائیں اور اس سے ایسی باتیں یا افعال منسوب کیے جائیں جو اس نے نہ کہے نہ کیے ’اخلاقی لحاظ سے یہ چیز انتہائی معیوب ہے‘ شریعت کی بیشتر نصوص میں اس سے منع کیا گیا ہے ’نبی ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

”جس شخص میں چار چیزیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے، اور جس کسی میں ان میں سے ایک خصلت بھی پائی جائے تو اس میں نفاق کی ایک خصلت پائی جائے گی‘ یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے‘ اگر اسے امانت سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے‘ جب عہد و پیمان کرے تو غداری کرے اور جب جھگڑا کرے تو اس میں فحور کرے۔“

(۱)

یہ جو آخری بات بیان ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی سے اختلاف ہو تو اپنی جیت کے لیے مخالف شخص پر زیادتی کرے اور اس سے وہ کچھ منسوب کرے جو اس نے نہ کہا اور نہ ہی کیا۔ یہی تو منافقین کی نشانی ہے اور اللہ ہمیں ایسی خصلت سے بچائے‘ کچھ لوگ بزم خود دین کی نصرت کے لیے منافقین کی خصلتوں کو اپنالیتے ہیں حالانکہ جھوٹ، خیانت اور فجور سے دین کی مدد نہیں کی جاسکتی‘ دین تو آیا ہی اس لیے ہے کہ اخلاق اور فضائل اعمال کی بنیادیں رکھے‘ حق ثابت کرنے کے لیے حرام چیزوں کو وسیلہ بنانے کی دین میں کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

{ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ } (التوبة: ۱۱۹)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کا ساتھ دو۔“

نبی ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

”سچائی اختیار کرو کیونکہ سچائی نیکی کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور ایک آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور سچ ہی کا متلاشی رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں صدیق

لکھا جاتا ہے، اور جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ نارِ جہنم کی طرف، اور ایک شخص جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کا متلاشی رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھا جاتا ہے۔” (۲)

جھگڑے میں فجور (یعنی گناہ کا ارتکاب) زیادتی اور سرکشی ہے اور اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ شخص اپنے خیال کے مطابق دین کی حمایت کرنے چلا ہو یا یہ سمجھتا ہو کہ مخالف کو کمزور کرنے کے لیے اس کی حجت کا توڑ کر ناضروری ہے۔ امت کے مابین اکثر اختلافات اسی نوع کے ہیں۔

بن تیمیہ رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

“اگر آپ امت کے علماء، عبادت گزار اشخاص، امراء اور رؤساء کے مابین واقع ہونے والے اختلافات کو بغور دیکھیں تو اس کو اسی قسم کا پائیں گے یعنی زیادتی چاہے تاویل کے ساتھ ہو یا بغیر تاویل کے، جیسے جمعی فرقے نے صفات الہی اور قرآن کے مسئلہ میں اہل سنت پر زیادتی کی اور جیسے ناصبی حضرات نے حضرت علی اور اہل بیت پر کی اور جیسے اللہ سے تشبیہ دینے والے تشبیہ کا انکار کرنے والوں پر کرتے ہیں یا جیسے بعض اہل سنت اپنے ہی حضرات پر یا بعض اہل بدعت پر اس طرح زیادتی کرتے ہیں کہ جو کچھ اللہ نے حکم دیا ہے اس سے زیادہ کہہ جاتے ہیں۔” (۳)

القرانی مخالفین کی تردید کرنے کی شرط بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

“مخالفین میں جو بری باتیں پائی جاتی ہیں انہیں حقیقت کے مطابق ہی بیان کرے، ان سے وہ فواحش اور منکرات منسوب نہ کرے جن کے وہ مرتکب نہیں ہوئے، ایک بدعتی کے بارے میں یہ نہ کہے کہ وہ شراب پیتا ہے یا زنا کاری کرتا ہے یا کوئی دوسرا ایسا الزام لگائے جو اس میں نہ پایا جاتا ہو۔” (۴)

حواشی

- ۱ بخاری (۳۴) مسلم (۲۱۹)۔
- ۲ مسلم (۶۸/۵)۔
- ۳ الفتاویٰ ۱۴: ۲۸۲-۲۸۳۔
- ۴ الفروق ۴: ۲۰۷-۲۰۸۔

مسلمانوں کی عزت و وقار کا خیال رکھنا

کتاب، سنت اور اجماع امت سے ایک مسلمان کی عزت و اقدار کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے اس لیے چاہے ادنیٰ سا شبہ ہو یا معمولی سا اختلاف ہو پھر بھی کسی پر زیادتی کرنے سے گریز کرنا چاہیے قرآن کریم میں ایک مسلمان کے خون، عزت اور مال کو حرام قرار دیا گیا ہے اور جہاں کہیں بھی ایک مسلمان کو تکلیف پہنچتی ہو وہاں پوری طرح چھان بین کرنے کا حکم دیا گیا ہے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم کے بارے میں بھی کہ جس پر جرم ثابت نہ ہوا ہو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِمَهَالَةٍ فَتُصْحَبُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ} (الحجرات: ۶)

”اے ایمان والو! اگر ایک فاسق شخص کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی چھان بین کر لو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لا علمی میں کسی قوم پر حملہ کر بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر نادم ہو۔“

اس آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان خبروں کے بارے میں تحقیق کا حکم دیا ہے جو دوسروں کے حقوق سے متعلق ہیں تاکہ ایک جھوٹی خبر کی بنا پر اس شخص کو تکلیف نہ پہنچے جس کی طرف خبر منسوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر مسلمان یا غیر مسلم کے حق کی تحدید نہیں کی ہے۔ صرف ”قوم“ کا لفظ ارشاد فرمایا جس سے مسلم غیر مسلم سب مراد ہو سکتے ہیں اور پھر خاص طور پر ایک مسلمان کو ایذا پہنچانے یا اس پر طعنہ زنی سے خبردار کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ط بئسَ الْأَسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ} يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَ

لَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبَ بَعْضُكُم بَعْضًا أَيُّحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا
فَكَرِهْتُمُوهُ ط وَاتَّقُوا اللَّهَ ط إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ ﴿۱۱-۱۲﴾ (الحجرات: ۱۱-۱۲)

”اے ایمان والو! مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور
نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور آپس میں ایک دوسرے
پر عیب نہ لگاؤ اور نہ کسی کو برے القاب سے یاد کرو ایمان کے بعد فسق برانام ہے اور جو توبہ نہ
کریں وہی ظالم لوگ ہیں۔ اے ایمان والو! بہت بدگمانیوں سے بچو یقین مانو کہ بعض بدگمانیاں
گندہ ہیں اور بھید نہ ٹھولا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے کیا تم میں سے کوئی بھی
اپنے مروہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ پھر تم کو اس سے گھن آئے گی اور اللہ سے ڈرتے
رہو۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔“

اے میرے برادر مسلم! ملاحظہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمانی کی عزت کو ان
بات کے طفیل ایک چار دیواری مہیا کر دی ہے اہل ایمان کو وصف ایمان (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا) سے خطاب فرمایا ہے تاکہ اللہ سبحانہ کے اوامر اور نہی کی اہمیت کو اجاگر کیا جاسکے۔

بے شمار احادیث میں یہی بات بیان ہوئی ہے ”میں ان میں سے صرف دو حدیثوں کا تذکرہ
کرتا ہوں: پہلی حدیث جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ
نے ارشاد فرمایا:

”نہ حسد کرو نہ ہی اپنے ساتھی کی بولی پر زائد بولی دو نہ ہی ایک دوسرے سے بغض رکھو نہ ہی
پیچھے پیچھے ایک دوسرے کی برائی کرو ایک شخص اگر کوئی بیع کر رہا ہے تو اسے میں دخل اندازی نہ
کرو اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے جو نہ
اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے رسوا کرتا ہے نہ اسے حقیر سمجھتا ہے اور پھر اپنے سینے کی طرف
شارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا: تقویٰ یہاں ہے ایک آدمی کے بد ہونے کے لیے اتنا ہی
کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے ہر مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کا خون
آبرو اور مال حرام ہے۔“ (۱)

حجۃ الوداع کے موقع پر زمان و مکان کے اعتبار سے عظیم ترین موقف میں اللہ کے
نبی ﷺ نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا: ”لوگو! یہ کون سا مہینہ ہے؟“ صحابہ نے کہا: اللہ اور
اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ کہا: ”کیا یہ ذوالحجہ کا مہینہ نہیں؟“ انہوں نے کہا: بے شک۔ پھر
فرمایا: ”یہ کون سا شہر ہے؟“ کہا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ کہا: ”کیا یہ بلد حرام
نہیں؟“ کہا: بے شک۔ پھر پوچھا: ”بتاؤ یہ کون سا دن ہے؟“ کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے

ہیں۔ کہا: ”کیا یہ قربانی کا دن نہیں؟“ کہا: بے شک۔ پھر کہا: ”تو تمہارے خون ’تمہاری آبرو اور تمہارے مال تم پر ایسے حرام ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت‘ تمہارے اس شہر میں اور تمہارے اس ماہ میں۔“ (۲)

اور نبی ﷺ جب ان سے کوئی سوال کرتے تو وہ طویل خاموشی اختیار کرتے ’ایسا معلوم ہوتا کہ اب جو سوال انہوں نے پوچھا ہے‘ اس کا جواب وہ کسی اور نام سے دیں گے ’پھر صحابہ کرام کے ادب کو دیکھیں کہ باوجود یہ کہ انہیں جواب معلوم ہے وہ علم کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاتے ہیں‘ اور یہ نبی ﷺ کے سامنے ادب کا ایک اونچا مقام ہے اور اس حدیث سے اس بات کی تاکید ہو گئی کہ سب سے بہتر وقت میں اور سب سے اعلیٰ جگہ پر ایک مسلمان کے خون ’مال اور آبرو کی حرمت پر مہر لگادی گئی۔

شیخ الاسلام کہتے ہیں:

”اصل یہی ہے کہ مسلمانوں کے مال ’خون اور آبرو ایک دوسرے پر حرام قرار دے دیے گئے ہیں سوائے اللہ اور اس کے رسول کی اجازت کے وہ حلال نہیں ہو سکتے۔“

ابن تیمیہ کہتے ہیں:

”جو لوگ اس جنس فعل کو حرام سمجھتے ہیں وہ تاویل کرنے والوں کی تھوڑی سی مذمت کر کے زیادتی کرتے ہیں جو بہر حال قلیل ہونے کی بنا پر قابل معافی ہے لیکن ان کے پیروکار مذمت کا دائرہ اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ جس سے وہ اپنے بھائیوں کی آبرو اور غیر آبرو کو حلال قرار دے دیتے ہیں کہ جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔“ (۳)

شوکانی اپنی کتاب ”رفع الریبه“ میں لکھتے ہیں:

”جان لو کہ غیبت کا حرام ہونا کتاب ’سنت اور اجماع سے ثابت ہے اور اس بارے میں جو ارشادات کتاب و سنت میں بیان ہوئے ہیں وہ عمومی نوعیت کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے کسی بھی فرد کے لیے کسی بھی دوسرے فرد کی غیبت جائز نہیں ہے۔ کسی بھی موقع پر ایک مسلمان کی غیبت اسی وقت جائز ہوگی جب کہ اس عموم کے مقابلہ میں کوئی خصوصی دلیل اسے جائز قرار دے اور اگر ایسی دلیل موجود ہو تو سر آنکھوں پر و گرنہ ایسا کرنا اللہ کے بارے میں وہ کہنا ہے کہ اس نے نہیں کہا اور بغیر کسی دلیل کے اس چیز کو حلال ٹھہرانا ہے جسے اللہ نے حرام قرار نہیں دیا۔“

ابن القیم ارشاد فرماتے ہیں:

”یہ عجب بات ہے کہ آدمی کے لیے اکل حرام ’ظلم ’زنا ’چوری ’شراب ’خمر‘ حرام نظر وغیرہ

سے بچنا آسان ہوتا ہے، لیکن اپنی زبان کو قابو کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے، کتنے ہی آدمیوں کو تم دیکھتے ہو کہ وہ بدکاری اور ظلم سے بچے ہوئے ہیں لیکن ان کی زبان زندوں اور مردوں کے بارے میں قینچی کی طرح چل رہی ہوتی ہے اور انہیں قطعاً پروا نہیں ہوتی کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔” (۵)

اس لیے اے برادر مسلم! کسی بھی اختلاف اور شبہ کی وجہ سے اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حرام و حلال نہ ٹھہراؤ۔ ایک مسلمان کی آبرو کو محفوظ قرار دے دیا گیا ہے، بغیر کسی قطعی دلیل سے اسے عین سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری حدیث: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:
”کوئی بھی شخص دوسرے کسی شخص کو فسق کا طعنہ نہ دے، اور نہ ہی کفر کا، اگر وہ شخص حقیقتاً ایسا نہ ہو تو تو یہ کلمہ طعنہ دینے والے کی طرف لوٹ آئے گا۔” (۶)

صحیح مسلم کی روایت میں ہے:
”اگر کسی شخص نے کسی دوسرے کو کافر کہا یا اللہ کا دشمن کہا حالانکہ وہ ایسا نہ تھا کہ یہ کہنا اس پر پٹ جائے گا۔” (۷)

تیسرے کہتے ہیں:
”حاصل کلام یہ ہوا کہ اگر وہ شخص جسے کافر کہا گیا ہے واقعی شرعاً کفر کا مرتکب ہے تو قائل سچا ہے اور اس کا قول صحیح جگہ پر وارد ہوا ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو قائل گناہگار ہے بلکہ اس قول کی وجہ سے وہ سزاوار بھی ٹھہرے گا۔” (۸)

چوتھے کہتے ہیں:
”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایک شخص نے دوسرے سے کہا تم فاسق ہو یا کافر ہو تو اگر وہ واقعتاً ایسا نہیں ہے تو پھر اس بات کا کہنے والا فاسق یا کافر ٹھہرا لیکن اگر وہ ایسا ہی تھا تو سچ بولنے کی بنا پر اس پر کوئی وبال نہ ہوگا۔” (۹)

کسی کو کافر کہنے والے کے پاس دوسرے کے کفر کے بارے میں حقیقی طور پر کچھ ثابت کرنا ممکن نہیں ہوتا، وہ صرف اپنے گمان کے طور پر ایسا کہتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا گمان سچا نہ ہو۔ اس لیے کسی کو کافر کہنا خطرے سے خالی نہیں اور اگر اس سے بچا جائے تو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ تاہم کافر کہنے سے بچنے میں ہی سلامتی ہے۔

حواشی

- (۱) صحیح مسلم، نمبر ۶۴۹۳
- (۲) صحیح البخاری، نمبر ۶۷، صحیح مسلم ۱۶۷۹، یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔
- (۳) الاستقامہ ۱: ۱-۳۰۲
- (۴) رفع الریبۃ، بضمن مجموعة الرسائل المنيرية ۱: ۵۰
- (۵) الداء والدواء، ص ۱۸۷۔
- (۶) صحیح البخاری، نمبر ۶۰۴۵
- (۷) صحیح مسلم، نمبر ۶۱
- (۸) فتح الباری ۱۰: ۴۶۶
- (۹) ایضاً ۱۰: ۴۶۶

ظاہری افکار کی روشنی میں معاملہ کرنا

مخالف سے مناظرہ کرتے وقت یا اس پر تنقید کرتے وقت اس کی نیت یا باطن کو نہ چھیڑا جائے بلکہ جو نیکو خیال ہو اس پر کلام کیا جائے نیتوں یا قلبی اعمال کو چھیڑنا صحیح نہیں ہے اگر مخالف موافقت کی بات نہ تو چاہے وہ ہمارے گمان کے مطابق اس پر اعتقاد نہ رکھتا ہو ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیے الا یہ کہ اس میں مذہب میں جھوٹ بولنا جائز ہو یا واجب ہو ایسی صورت میں ہمیں اس کی بات قبول کرنے میں احتیاط نہ چاہیے۔ اس لیے دنیوی حد تک اسلام میں لوگوں کے ظاہری افکار کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے اور جہاں نیکو نیت کے پوشیدہ اعمال کا تعلق ہے تو اللہ عز و جل اس کا حساب کریں گے اور اسی بنیاد پر اللہ کے نبی ﷺ نے منافقوں سے ان کے اعلان اسلام کو قبول کر لیا تھا حالانکہ وہ اگر سب نہیں تو ان میں سے کچھ لوگوں کے بارے میں بخوبی علم رکھتے تھے اور پھر ان کے ظاہر کے حساب سے ان سے معاملہ نہی رکھیں۔

ابن تیمیہ منافقین کے ساتھ نبی ﷺ کے تعامل کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

”نبی ﷺ کو جب تک منع نہیں کیا گیا وہ ان پر نماز جنازہ بھی پڑھتے رہے اور ان کے لیے مغفرت کی دعا بھی کرتے رہے منع کیے جانے کا سبب ان کا کفر تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ باطن میں کافر ہے اس پر نماز پڑھی جاسکتی ہے اور اس کے لیے دعائے استغفار کی جاسکتی ہے چاہے وہ بدعت کا یا گناہوں کا مرتکب کیوں نہ ہو۔“

نہیں فرماتے ہیں:

”مقصود یہ ہے کہ صرف گناہ کے ارتکاب سے یا کسی بدعت کے جاری کرنے سے اور چاہے وہ اس کا داعی بھی ہو اسے باطنی طور پر کافر قرار نہیں دیا جاسکتا الا یہ کہ وہ منافق ہو اور جو شخص دل سے اللہ کے رسول پر اور آپ کی الائی ہوئی تعلیمات پر ایمان رکھتا ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض بدعتوں کی تاویل بھی کرتا ہو وہ سرے سے کافر نہیں ہے۔ صحابہ میں سے نہ حضرت علیؓ اور نہ کوئی اور انہیں کافر قرار دیتا تھا بلکہ وہ انہیں ظالم اور سرکش مسلمان قرار دیتے تھے اور اس بارے میں ہم دوسری جگہ پر آثار و احادیث درج کر چکے ہیں۔“ (۱)

اگر ان لوگوں کے بارے میں کہ جنہوں نے مسلمانوں کو کافر قرار دیا اور ان کا خون بہانا جائز سمجھا یہ قتل درکھا جاسکتا ہے تو پھر ان مسلمانوں کے بارے میں بالاولیٰ یہ اعتقاد رکھنا جائز ہو گا کہ جو کسی غلطی یا نیت کے مرتکب ہوئے ہوں اور خاص طور پر وہ اہل علم میں سے بھی ہوں۔

حاشیہ

مخالف کے ساتھ انصاف کرنا واجب ہے

مخالف کے ساتھ انصاف ان چند امور میں ہو سکتا ہے:

- (۱) اس کے علم کا اعتراف کرنا۔
 - (۲) اس کی صحیح بات کو ماننا۔
 - (۳) اس کی بات کا وہ مطلب نہ نکالنا کہ جو اس میں نہیں پائی جاتی۔
- ایسا انصاف کرنا شریعت کا تقاضا ہے اور یہ مخالف کے لیے حق کو قبول کرنے کی کنجی ہے۔ انصاف کا دامن چھوڑنے کے اسباب کا امام شوکانی نے بہت عمدگی سے ذکر کیا ہے 'وہ کہتے ہیں: جان لیجیے کہ دائرہ انصاف سے نکلنے اور تعصب کی ہلاکتوں میں پڑنے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں جن میں سے چند کا تذکرہ ملاحظہ ہو:

- (۱) ایک طالب علم ایک خاص مذہبی ماحول میں پلا بڑھا ہو یا کسی خاص عالم سے اس نے استفادہ کیا ہو جس کی بنا پر اس میں تعصب پایا جائے اور انصاف نہ کر سکے یعنی اس مذہب پر تعصب کا اظہار کرے اور دوسرے کسی کو نہ مانے۔

- (۲) مال 'عزت و جاہ کی محبت' جہاد سلطنت اور اصحاب اقتدار کی چاپلوسی کرنا اور ان سے امیدیں باندھنا اور اس بنا پر ان کا خیال رکھنا اور انصاف نہ کرنا۔ (۱)

شوکانی کے نعتیہ کلام سے پہلے میں یہاں امام ابن القیم اور ایک عیسائی پادری کے مابین مناظرے کا ذکر کرتا چلوں جس سے معلوم ہو گا کہ دنیا کے پجاریوں پر وجاہت اور حصول عزت کا بھوت کیسے چھا جاتا ہے:

امام ابن القیم کہتے ہیں: میں نے دن کا اکثر حصہ ایک عیسائی عالم کے ساتھ مناظرہ کرتے گزارا جب اس پر حق واضح ہو گیا تو وہ مبہوت ہو کر رہ گیا جب ہم دونوں اکیلے تھے تو میں نے اُس سے پوچھا: اب تمہیں حق کے اتباع سے کون سی چیز روکتی ہے؟ تو وہ کہتا ہے: "جب ہم ان گدھوں کے پاس جاتے ہیں (یہ اس کے الفاظ ہیں) تو وہ میری سواری کے کھروں کے نیچے کپڑے بچھاتے ہیں۔ اپنے اموال اور اپنی عورتوں کے بارے میں میرے فیصلے کو قبول کرتے ہیں جو کچھ میں کہوں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اب نہ میں کوئی ہنر جانتا ہوں نہ قرآن نہ نحو نہ فقہ اگر آج مسلمان ہو جاؤں تو بازاروں میں بھیک مانگتا پھروں گا اور کون ہے جو یہ بات اپنے لیے پسند کرے گا۔

”میں نے کہا: ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تم اللہ سے یہ گمان کیوں رکھتے ہو کہ اگر تم اپنی خواہشات پر اس کی پسند کو ترجیح دو گے تو وہ تمہیں ذلت و رسوائی سے دوچار کرے گا اور تم حاجت مند رہ جاؤ گے؟“ اور فرض کر لو کہ اگر ایسا ہوا بھی تو جو کچھ تم نے حق کی صورت میں پایا ہے اور یہ کہ تم نار جہنم سے بچ گئے ہو اور اللہ کی ناراضگی اور غضب سے بھی محفوظ ہو گئے ہو تو اس میں تمہیں ان چیزوں کا پورا پورا بدلہ مل گیا ہے جو تم سے چھوٹ گئی ہیں“ تو کہنے لگا: ”اس وقت تک جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو“ میں نے کہا: تقدیر سے حجت نہیں پکڑی جاتی؟ اور اگر تقدیر حجت ہوتی تو پھر یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السلام کو جھٹلانا حجت بن جاتا اور اسی طرح مشرکین کا رسولوں کو جھٹلانا تم لوگوں کو تو خاص طور پر یہ زیب نہیں دیتا کہ تم لوگ ویسے ہی تقدیر کا انکار کرتے ہو تو پھر اس سے حجت کیوں پکڑتے ہو“ تو کہنے لگا: یہ باتیں چھوڑ دو اور پھر اس نے راہ فرار اختیار کی۔“ (۲)

اب ہم شوکانی کی باقی باتوں کی طرف آتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

(۳) اہل علم کے ساتھ جھگڑے اور مناظرے کرنا کہ جس سے اپنی خود نمائی اور غلبے پن کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں مخالف کا تعصب مزید گہرا ہو جاتا ہے اور وہ انصاف نہیں کر پاتا ہے۔

(۴) اپنے ہم نوا لوگوں کے مذہب کی طرف میلان رکھنا، ان کی تائید میں دلائل کی تلاش میں لگے رہنا کہ جس سے ان کے علم و فضل کی نمائش مقصود ہوتی ہے، وہ غلط ہوں تب بھی ان کا ساتھ دینا اور انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا (مراد یہ ہے کہ اپنے سے قریب جماعتوں، پارٹیوں اور مذاہب کی حمایت میں لگے رہنا) حق تک پہنچنا مقصد نہیں ہوتا بلکہ ان کی تقویت میں دلائل کا تلاش کرنا مقصود ہوتا ہے، حق تو حق ہے چاہے وہ اپنوں کے پاس ہو یا غیروں کے۔

(۵) لوگوں کے ڈر سے اس بات میں حرج محسوس کرنا کہ میں اپنے اس فتویٰ یا قول سے رجوع کر لوں جو لوگوں میں مشہور ہو چکا ہے لیکن اس کا غلط ہونا بھی ثابت ہو چکا ہے اور پھر وہ صرف اس حرج کی بنا پر اپنے موقف پر قائم رہتا ہے اور انصاف نہیں کرتا۔

(۶) عمر میں اپنے سے چھوٹے اور علم و شہرت میں اپنے سے کم تر فرد کے ساتھ مناظرہ کرتے وقت اگر غلطی ہو جائے تو پھر اس غلطی سے چمٹے رہنا اور انصاف نہ کرنا۔

(۷) ایسے متعین قواعد کا لحاظ کرنا جو اس کے لیے مفید ہوں اور مخالف کے لیے غیر مفید حالانکہ وہ خود مسلمہ قواعد میں سے نہ ہوں اور اس بنا پر تعصب کی راہ اختیار کرنا اور انصاف نہ کرنا۔

(۸) اپنے مذہب کی کتابوں پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے قول پر اڑے رہنا چونکہ اس طرح اپنے مذہب کی برتری اور مخالف کے مذہب کی کمزوری ظاہر کرنا مقصود ہوگی اور یہ بھی تعصب

اور نا انصافی کا باعث ہوگی۔

(۹) جرح و تعدیل کے باب میں متعصب قسم کے مؤلفین کی کتابوں پر انحصار کرنا کہ جن میں اس کے موافق راوی کی تعدیل کی گئی ہو اور مخالف راوی پر جرح کی گئی ہو ایسی کتابوں پر انحصار کرنے سے تعصب اور نا انصافی کا راستہ کھلتا ہے۔

(۱۰) علم و فضل اور قدر و منزلت میں اگر دو شخص قریب قریب ہوں تو تعصب اور نا انصافی کی بنا پر ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے پر اتر آتے ہیں۔

(۱۱) رائے پر مبنی علوم جن میں اجتہادی علوم و فنون جیسے اصول فقہ کی آمیزش ہوتی ہے، پر کلی اعتماد کرنا جس کے نتیجے میں رائے پر تعصب اور راہ انصاف کو چھوڑنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

(۳)

انصاف کے بعض نمونے

چند نمونے ملاحظہ ہوں کہ علماء اپنے مخالفین کے ساتھ کیسے انصاف کیا کرتے تھے:

☆ ابن تیمیہ چند مخالف تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے اصحاب تالیف کے لیے خود ہی عذر تلاش کر لیتے ہیں "ارشاد کیا جیسے رازی کی"، "المباحث الشرقیہ" اور اس جیسی دوسری کتابیں "اور پھر متکلمین کے ان دلائل کا ذکر کرتے ہیں کہ جن کے مطابق ایسے حوادث کا ہونا ناممکن ہے جس کی کوئی ابتداء نہ ہو اور یہ کہ زمانے "حرکت اور جسم کا ایک آغاز ضروری ہے" پھر وہ ان کے دلائل کی تردید کرتے ہیں "اپنا جواب دیتے ہیں اور اس کی تائید کرتے ہیں:" جو یہ کہتا ہے کہ ان کا کوئی آغاز نہیں "اور وہ ایسا جان بوجھ کر باطل کو سراہنے کے لیے نہیں کرتے بلکہ وہ وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کی بحث و تحقیق کے مطابق عقلی دلائل سے ثابت ہوتا ہے "اگر انہیں عقلی دلائل میں کوئی ایسی بات ملے جس سے وہ فلاسفہ کے کلام کی تردید کر سکیں تو وہ ایسا کر گزرتے ہیں کیونکہ ان کا منطق نظر صرف اتنا ہوتا ہے کہ مطلق تحقیق ہونی چاہیے "تو جہاں وہ اپنی بات کرتے ہیں اس بنا پر کچھ لوگ ان سے بدظنی کرتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر باطل کی حمایت کر رہے ہیں "لیکن ایسا ہر گز نہیں ہے بلکہ وہ ہر مقام پر جو چیز انہیں بحث و نظر اور علم کی روشنی میں صحیح لگتی ہے اسے بیان کر دیتے ہیں"۔ (۴)

ابن تیمیہ رحمہ اللہ یہاں رازی سے عہداً باطل کی حمایت کی نفی کر رہے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ ایک محقق ہیں اور اس سے قطع نظر کہ ان کی رائے صحیح ہے یا غلط "وہ ان کی تحقیق کے نتیجے کو بیان کرتے ہیں" گویا ابن تیمیہ ان کے بارے میں اپنی منصفانہ رائے پیش کر رہے ہیں حالانکہ انہوں نے رازی کے عقائد کے بارے میں ایک عظیم کتاب بعنوان "بیان تلخیص الجمیہ" لکھی ہے جو آخری طبع شدہ نسخے کے مطابق دس جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور جس میں وہ

رازی کے عقائد اور منہج پر بالتفصیل گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

☆ ابن تیمیہ ابو بکر باقلانی کے بارے میں ابو حامد اسفرائینی کے موقف کو بیان کرتے ہیں اور باقلانی کو اہل تاویل کے سرخیل ہونے کے باوجود ان کی فضیلت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

”لیکن اس کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ وہ بڑے فضائل اور محاسن رکھتے ہیں۔ زنادقہؒ ملحدین اور اہل بدعت کی تردید میں پیش پیش ہیں اور ابن کلاب اور اشعری سے نسبت رکھنے والوں میں ان سے بڑھ کر صاحب قدر اور صاحب تصنیف کوئی اور نہیں ہوا اور انہی کی وجہ سے یہ قول مشہور ہوا۔“ (۵)

☆ ذہبیؒ الحاکم کے بارے میں فرماتے ہیں:

”محمد بن عبد اللہ الضبی النیسابوریؒ الحاکمؒ ابو عبد اللہؒ الحافظؒ صاحب تصانیف ہیں، امام ہیں، صدوق ہیں لیکن اپنی کتاب ”المستدرک“ میں بہت سی گری پڑی احادیث کو صحت کا درجہ عطا کر دیتے ہیں اور مجھے نہیں معلوم کہ ان کی حقیقت سے وہ واقعی ناواقف تھے، ان جیسے شخص سے ایسی بات کا مخفی رہنا بعید ہے، اور وہ علم ہونے کے باوجود ایسا کرتے تھے تو یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے، مستزاد یہ کہ وہ مشہور شیعہ ہیں لیکن شیخین (ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ ابن طاہر کہتے ہیں میں نے ابو اسماعیل عبد اللہ الانصاری سے ابو عبد اللہ الحاکم کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: حدیث میں امام ہیں اور خبیث رافضی بھی ہیں۔ پھر ذہبی کہتے ہیں: میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انصاف کو پسند کرتے ہیں، وہ رافضی نہیں ہیں فقط شیعہ ہیں۔“ مزید کہا: امت کا اجماع ہے کہ الضبی کذاب ہے اور اس کا یہ کہنا کہ مصطفیٰ ﷺ کی ولادت اس حال میں ہوئی کہ وہ ختنہ شدہ تھے، تو اتر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ کہنا کہ حضرت علیؑ نے وصیت کی تھی، البتہ بذات خود سچے ہونے میں اور ان معاملات کی خبر رکھنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان کی وفات ۴۰۵ھ میں ہوئی۔“ (۶)

☆ ذہبیؒ لسان المیزان میں لکھتے ہیں:

”الحاکم اپنی قدر و منزلت، اہمیت اور ناموری کی بنا پر اس بات سے اعلیٰ وارفع ہیں کہ ان کا نام ضعیف راویوں میں لکھا جائے، ان کی طرف سے یہ عذر بیان کیا جاتا ہے کہ اپنی کتاب ”المستدرک“ کی تالیف کے وقت وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں تھے، اور کچھ لوگوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آخر عمر میں وہ غفلت اور تبدیلی حال کا شکار ہو گئے تھے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ”الضعفاء“ میں کچھ راویوں کا ذکر کیا ہے اور ان سے روایت نہ کرنے کا بالجزم ذکر کیا ہے، پھر ”المستدرک“ میں ان میں سے بعض راویوں کی احادیث کو بھی درج کیا ہے اور انہیں صحیح قرار دیا ہے، جیسے عبد الرحمن بن زید بن اسلم کی حدیث حالانکہ وہ انہیں ”الضعفاء“ میں شمار کر چکے ہیں اور وہاں ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس نے اپنے باپ سے موضوع احادیث کی روایت کی ہے اور اس علم کی مہارت رکھنے والے ادنیٰ تامل سے یہ

معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔

اپنی کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں:

”یہ وہ لوگ ہیں جن کا میں نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے، میرے نزدیک ان کی سچائی ثابت ہو چکی ہے، وہ اس لیے کہ میں جرح اسی وقت قبول کرتا ہوں جب وہ تفصیل سے بیان کی گئی ہو، میں کسی کی تقلید میں اسے جائز و انہیں رکھتا، ایسے لوگوں کی احادیث کے بارے میں میں طلبہ کو یہی مشورہ دوں گا کہ وہ ان کی احادیث قطعاً نہ لکھیں۔“ (۷)

☆ ذہبی بشر المریسی کے بارے میں ایسا ہی لکھتے ہیں کہ:

”وہ شر والے بشر ہیں، جیسے بشر الحافی خیر والے بشر ہیں، جیسے احمد بن حنبل سنت والے احمد ہیں اور احمد بن ابی داؤد بدعت والے احمد ہیں۔“

”اور جو شخص چاہے کتنی ہی بڑی بدعت کی وجہ سے کافر قرار دیا جائے وہ اصلی کافر یا یہودی یا مجوسی کی مانند نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ایک ایسے شخص کو جو اللہ کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، پھر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ پر عامل ہو چاہے وہ کچھ بڑے منکرات اور بدعت کا مرتکب ہو کر گمراہ بھی ہو چکا ہو، اس شخص کے برابر کیسے قرار دے سکتا ہے جو رسول کا دشمن ہو، بتوں کی عبادت کرتا ہو، شریعتوں کا منکر ہو، کفر کا مرتکب ہو، اور ہم خود بدعت اور اہل بدعت سے اللہ کے ہاں برائت کا اظہار کرتے ہیں۔“ (۸)

یہ نہایت خوبصورت بات ہے کہ اس مسلمان کے جس پر کفر کا حکم لگایا گیا ہو اور اصلی کافر کے درمیان فرق روار کھا جائے، اور یہ کہا جائے کہ اس کا کفر اصلی کفر کی مانند نہیں ہے، جو اسے ملت سے باہر نہیں کرتا اور یہ کہ وہ عملی نفاق کی طرح عملی کفر کا درجہ رکھتا ہے۔ اسحاق بن راہویہ ابو عبیدہ قاسم بن سلام کی علمی فضیلت کا اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ حق کو پسند کرتے ہیں، ابو عبیدہ القاسم بن سلام مجھ سے زیادہ علم اور فقہ رکھتے ہیں۔“

(۹)

امام احمد بن حنبل اسحاق کے بارے میں کہتے ہیں:

”اسحاق کی مانند کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں دیکھا جو پل پار کر کے خراسان آیا ہو، گوانہوں نے بعض باتوں میں ہم سے اختلاف کیا، لیکن یہ تو دستور دنیا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں۔“ (۱۰)

حواشی

(۱) باقی اسباب کا مع حوالہ جات بعد میں ذکر آ رہا ہے۔

(۲) ہدایۃ الحیاری، ۱: ۹۷۔

(۳) أدب الطلب ومنتہی الأرب، ۱۲۱: ۳۱

- (۴) الفتاویٰ ۱: ۲۹، چھٹے ضابطے میں یہ بات مذکور ہو چکی ہے۔
- (۵) المجموع ۲۸: ۱۸۸-۱۸۹
- (۶) میزان الاعتدال: ترجمہ نمبر ۷۸۰۴
- (۷) لسان المیزان ۵: ۲۳۲۔
- (۸) سیر اعلام النبلاء ۱۰: ۲۰۲
- (۹) ایضاً ۱۰: ۲۹۰، ۵۰۹ بحوالہ ترجمہ ابی عبید، نزہۃ الفضلاء ۷: ۷۷۵۔
- (۱۰) ایضاً ۱: ۳۵۸، ۳۸۳ بحوالہ ترجمہ اسحاق بن راہویہ، نزہۃ الفضلاء ۷: ۸۴۰۔

عدل کا دامن تھا مے رہنا

یہ ضابطہ پچھلے ضابطے کا تتمہ ہے ’دونوں میں یا تو بہت لطیف سا فرق ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے‘ لیکن علیحدہ ذکر کرنے میں وضاحت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔
دین اسلام جن بنیادوں پر قائم ہے ان میں ایک ”عدل“ ہے جس کا مطلب ہے لوگوں کو بغیر کسی کمی کے ان کے حقوق دینا چاہے وہ مادی حقوق ہوں یا معنوی حقوق ہوں۔ اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں:

{ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ } (الانعام: ۱۵۲)

”اور جب تم بات کرو تو انصاف کرو گو وہ شخص قرابت دار ہی ہو اور اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا اس کو پورا کرو“ ان کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکید کی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔“

اور پھر ارشاد فرمایا:

{ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اِعْدِلُوا ۖ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ } (المائدہ: ۸)

”اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دین والے بن جاؤ کسی قوم کی عداوت تمہیں خلافِ عدل پر آمادہ نہ کرے“ عدل کیا کرو جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔“

مفسر بیضاوی { وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا } کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہاں حرف ”علی“ ”لا کر کسی چیز پر ابھارنے کا مفہوم لایا گیا ہے“ تو پھر معنی یہ ہوا کہ مشرکین سے شدید نفرت تمہیں ان کے بارے میں انصاف کرنے سے نہ روکے اور پھر تم ان کے ساتھ وہ کچھ کرو جو جائز نہیں جیسے لاش کا مثلہ کرنا بدکاری کی تہمت لگانا بچوں عورتوں کو قتل کرنا عہد کو توڑنا تاکہ تمہارا کیجہ ٹھنڈا ہو۔

پھر کہا: { اَعْدِلُوا هُوَ اقْرَبُ لِلتَّقْوَى } یعنی انصاف کرنا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ عدل کرنے کا صاف صاف حکم دیا اور خواہشات کے پیچھے لگنے کے نتیجے میں ظلم و جور سے منع کرنے کے بعد بتایا کہ عدل کا تقویٰ کی میزان میں کیا درجہ ہے۔ اگر کفار کے ساتھ بھی اس درجے کا عدل مطلوب ہے تو اہل ایمان کے ساتھ عدل کا کیا مقام ہوگا۔ (۱)

اسی آیت کے بارے میں ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

”اس بات سے روکا کہ کفار کی نفرت کہیں تمہیں ان کے ساتھ عدل کرنے سے نہ روک دے“ تو اگر اہل ایمان میں سے کسی فاسق یا بدعتی تاویل کرنے والے سے نفرت پائی جاتی ہو تو پھر اس کے ساتھ انصاف کرنا تو اور زیادہ ضروری ہوا چاہے اس نے ظلم کیوں نہ کیا ہو۔ یہ مقام دین و دنیا کے اعتبار سے بڑے نفع کا مقام ہے کیونکہ شیطان بنی آدم کو گمراہ کرنے پر مامور ہے اس کے پیچھے کا شکار کبھی ہوتے ہیں کوئی بھی ایسی باتوں سے بچا ہوا نہیں ہے پھر ان باتوں کا کیا کہنا جو اس قسم کی ہوں کہ بر بنائے اجتہاد یا غیر اجتہاد کسی حکم کے بجالانے میں یا کسی ناجائز چیز کے ارتکاب میں تقصیر واقع ہو جائے چاہے وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔“ (۲)

ابن تیمیہ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

”اور جو شخص اپنے مخالفین کے ساتھ انصاف نہیں کرتا اور ان کے لیے اجتہادی غلطی کا عذر تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس حد تک چلا جاتا ہے کہ انہیں دشمنی کی نگاہ سے دیکھتا ہے یا ان کی تکفیر کرتا ہے تو وہ خود اپنی جان پر ظلم کرتا ہے اہل سنت اور اصحاب علم و ایمان ایسے نہیں ہیں وہ حق کو پہچانتے ہیں اور مخلوق خدا پر رحم کرتے ہیں۔“

اور پھر ارشاد فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ علم و عدل پر مبنی کلام کو پسند کرتے ہیں اور جہالت و ظلم پر مبنی کلام کو ناپسند فرماتے ہیں۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا قاضی تین طرح کے ہوتے ہیں دو آگ میں جانے والے اور ایک جنت میں! وہ شخص جس نے جہالت پر مبنی فیصلہ کیا وہ جہنم میں گیا اور وہ شخص جو حق کو جاننے کے باوجود اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ بھی جہنم میں اور جس نے حق کو جاننے کے بعد اس کے مطابق فیصلہ کیا وہی جنت کا مستحق ہوگا۔“ (۳)

اور پھر کہا:

”ہمیں عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے اگر ایک یہودی یا نصرانی چہ جائیکہ وہ رافضی ہو حق کی بات کہے تو ہمیں اسے رد نہیں کرنا چاہیے ہم رد کریں مگر اتنا ہی جتنا باطل اس میں پایا جاتا ہے نہ کہ حق کو۔“ (۴)

ابن تیمیہ سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو ایک رافضی پر یہود اور نصاریٰ کو فوقیت دیتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا:

”الحمد للہ! جو شخص ہر اس چیز پر جو محمد ﷺ لے کر آئے ایمان لایا وہ اس سے بہتر ہے جو ان

سب کا انکار کرتا ہے چاہے اس مومن میں بدعت کی کوئی قسم کیوں نہ پائی جاتی ہو چاہے یہ بدعت خوارج کی ہو یا شیعہ، مرجہ یا منکرین تقدیر وغیرہ کی ہو کیونکہ یہود و نصاریٰ کا کفر دین اسلام میں اضطرابی طور پر معلوم ہے، ایک بدعتی اگر یہ سمجھتا ہو کہ وہ رسول کا مخالف نہیں بلکہ موافق ہے تو وہ کافر نہ ہوگا اور اگر فرض کر لیں کہ وہ کافر ہی ہے تب بھی اس کا کفر اس شخص کی مانند نہیں ہے جو رسول ﷺ کو چھٹلاتا ہو۔ ” (۵)

خیر و شر کے درجات کے درمیان مقابلہ کرتے ہوئے وہ ارشاد فرماتے ہیں:

”خیر و شر کے درجے ہیں کچھ لوگ اپنی سابقہ حالت سے ایک بہتر حالت میں منتقل ہو کر ان درجات سے فائدہ اٹھاتے ہیں؟ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بہت سے رافضی، جمعی عقائد کے لوگ بلاد کفار گئے اور ان کے ہاتھوں پر بہت سی مخلوق خدا مسلمان ہوئی اور ان سے فیض یاب ہوئی گو وہ بدعتی مسلمان ہے، لیکن یہ ان کے لیے کافر بننے سے بہتر تھا۔ ” (۶)

ایک رافضی عورت سے شادی کے بارے میں ان سے سوال کیا گیا تو جواب دیا:

”خالص رافضی بدعتی ہیں، گمراہ ہیں، خواہش کے پیروکار ہیں، ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ جس عورت کا ولی ہے اسے ایک رافضی سے بیاہ دے، اگر اس نیت کے ساتھ رافضی عورت سے شادی کر لے کہ وہ شاید توبہ کر لے گی تو اس کا نکاح درست ہوگا۔ ویسے ایسی عورت سے نکاح نہ کرنا ہی افضل ہے تاکہ وہ اس کے بچوں کو بھی نہ بگاڑ دے اور اللہ بہتر جانتے ہیں۔ ” (۷)

ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ---- اللہ ان پر رحمت کرے ---- رافضیوں کو کافر قرار نہیں دیتے، گو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ امت کے لیے بڑے خطرے کا باعث ہیں، پھر بھی انہوں نے ان کے بارے میں انصاف سے کام لیا، دیکھئے انہوں نے ان کو بدعتی کہا ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اسے معصیت قرار دیا ہے کہ جو توبہ کی محتاج ہے، کافر کو یہ نہیں کہا جاتا کہ توبہ کرو بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام قبول کرو۔

ہاں! مذکورہ رائے میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو قرآن کے مخالف اعتقاد رکھتے ہوں یا ایسا عقیدہ رکھتے ہوں جو دین ہی کو باطل قرار دے دے، ایسے عقائد کفریہ عقائد ہیں لیکن کسی ایک متعین شخص کی بغیر کسی کھلی دلیل کے تکفیر کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

حواشی

(۱) تفسیر بیضاوی، سورة المائدة: آیت ۸

(۲) الاستقامہ ۱: ۳۸

مخالف کا احترام کرنا اور اس میں کیڑے نہ

نکالنا

شرعی علم سے متعلق ہر محقق دینی مسائل میں اپنے اپنے فہم کا ذمہ دار ہے اور اپنے فہم اور اپنے یقین کے مطابق عبادت کے عمل میں بھی مصروف ہے اور اگر ایک طالب علم کسی نص کے فہم یا کسی مسئلہ کے حکم کے بارے میں اپنے ہی جیسے طالب علم بھائی سے اختلاف کر لے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان دونوں میں سے ایک گنہگار ہے جو اس بات کا مستحق ہے کہ اسے سزا دی جائے یا اسے چھوڑ دیا جائے یا اس کی قدر و منزلت میں کمی کی جائے یا اس پر تہمت لگائی جائے کہ وہ جان بوجھ کر حق کی مخالفت کر رہا ہے یا ایسی ہی کوئی اور بات اس کے بارے میں کہی جائے اور صرف اس لیے کہ اس نے فہم مسئلہ میں یا اس پر حکم لگانے میں مخالفت کی ہے اس سے حقارت کا سلوک کیا جائے کیونکہ اس کا اپنا فہم اور حکم لگانا چاہے وہ خود مجتہد ہو یا مقلد مخالف کے فہم اور اجتہاد سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ اور اس لیے دونوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے دونوں ہی حق کے متلاشی ہیں اور بہتر ہے کہ وہ ادب کے ساتھ ایک دوسرے سے بات چیت کریں تاکہ حق تک پہنچ سکیں اور انہیں چاہیے کہ وہ ایک دوسرے پر کیچڑ نہ اچھالیں اور نہ ہی غیر مہذب الفاظ استعمال کریں۔ چند الفاظ ایسے ہیں جن میں تحقیر اور تنقیص کا شائبہ پایا جاتا ہے کسی بھی طالب علم کے لیے انہیں اپنے مخالفین کے حق میں استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے جیسے یہ الفاظ: یہ کہنا کہ فلاں بدعتی ہے یا حد سے بڑھا ہوا ہے یا کٹ جیتی ہے یا تساہل پسند ہے یا سطحی علم رکھتا ہے یا انتہائی سادہ ہے یا غفلت کا شکار ہے یا کند ذہن ہے یا جاہل ہے اور ایسے ہی دوسرے غیر مؤدب الفاظ۔

ایسے الفاظ لوگوں کے دلوں میں نفرت کا بیج بوتے ہیں اور یوں حق قبول کرنے سے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ابن امیر الحاج فرماتے ہیں:

”اگر لوگوں میں نفرت سما جائے تو دل اندھے ہو جاتے ہیں خیالات ماند پڑ جاتے ہیں اور خیر کا

دروازہ بند ہو جاتا ہے۔“ (۱)

امام شاطبی کہتے ہیں:

”امام غزالی نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے کہ عوام کے دلوں میں جہالت اس لیے غالب ہے کہ اہل حق اپنی جہالت کی بنا پر حق کو چیلنج کرنے کے انداز میں پیش کرتے ہیں اور اپنے کمزور مخالفین کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس سے ان کے دلوں میں بھی دشمنی اور مخالفت زور پکڑ لیتی ہے۔ انہیں اپنا باطل عقیدہ اور زیادہ عزیز ہو جاتا ہے اور پھر خیر اندیش علماء بھی اس فساد کے ظاہر ہو جانے کے بعد اسے مٹانے پر قدرت نہیں رکھ پاتے۔“

پھر شاطبی ارشاد فرماتے ہیں:

”جو کچھ انہوں نے کہا وہ بالکل درست ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس پر شاہد ہے۔“ (۲)

غزالی اپنی مایہ ناز کتاب احیاء علوم الدین میں ارشاد فرماتے ہیں:

”اگر وہ اپنے تعصب پر اکر جاتے ہیں تو پھر ان سے کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی کیونکہ تعصب کی بنا پر نفس میں عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے علماء سوء کی بری عادتوں میں سے یہ ایک عادت ہے کہ وہ حق کی خاطر تعصب رکھنے میں مبالغہ کرتے ہیں اور مخالفین کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔“

اور پھر وہ ارشاد فرماتے ہیں:

”اور ایسا کرنے سے باطل کے مددگار بھی زور پکڑ لیتے ہیں اور جو بات ان کی طرف منسوب کی جا رہی ہے وہ اس پر سختی سے چمٹ جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ بجائے تعصب یا تحقیر کے انداز کے نرمی اور شفقت سے کام لیتے اور تنہائی میں مخالف سے بات کرتے تو یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوتے۔“

اپنے اس طرزِ عمل کو وہ دین کے دفاع کا نام دیتے ہیں اور یہ کہ وہ مسلمانوں کی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں حالانکہ ایسا کرنے میں یقینی طور پر مخلوق خدا کی ہلاکت ہے اور لوگوں کے دلوں میں بدعت کو اور زیادہ مضبوط کرنا ہے۔“ (۳)

علماء کے ان حوالوں سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ بدزبانی اور تحقیری انداز مخالف کو حق قبول کرنے سے روکتا ہے بلکہ اسے دشمن بنا دیتا ہے اور یہ کہ بات اگر حق بھی ہو لیکن اس پر حد سے زیادہ تعصب کا اظہار کرنا مخالف کی ایک طرح سے توہین ہے کہ جس کی بنا پر وہ اپنے باطل عقائد پر اور زیادہ ڈٹ جاتا ہے۔ یعنی اہل حق کا حق کے اظہار کے لیے غلط راستہ اختیار کرنا مخالف کو حق اور اہل حق سے نفرت کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

حواشی

(۱) التقرير والتحییر ۶: ۱۱۹۔

(۲) الموافقات ۴: ۲۶۵۔

(۳) احیاء علوم الدین ۱: ۱۴۱۔

کسی کے بارے میں حکم نہ لگانا مگر مکمل

استقراء کے بعد

اگر کسی کے بارے میں اندازہ لگانا ہو یا اس پر حکم لگانا ہو تو سب سے پہلے اُس کے تمام اقوال و عقائد کا جائزہ لینا چاہیے ’ دیکھنا چاہیے کہ مختلف مسائل میں ان کا موقف کیا رہا ہے ’ ان کی اپنی تحریریں اور آثار کیا کہتے ہیں ’ مخالفین یا ان کی باتوں کو نقل کرنے والوں کے اقوال کی روشنی میں نہیں کہ یہ قرین انصاف نہیں۔ جو شخص کسی پر حکم لگاتا ہے وہ قاضی کے منصب پر فائز ہے اور قضاء کا تقاضا ہے کہ جس پر حکم لگایا جا رہا ہے یا جو اس کی نیابت کر رہا ہے اُس کے دلائل اور موقف کو سنا جائے ’ اُس لیے مخالفین پر حکم لگانے سے پہلے یا تو بلا واسطہ ان کی بات کو سنا جائے یا ان چیزوں کو جو اس کی نیابت کرتی ہیں جیسے اس شخص کی تالیفات یا اس کے ریکارڈ شدہ تقاریر یا اس کے ٹیپ۔ بی بی عین عدل سے جس کا ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

{ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ذَلِكُمْ وَصَّيْتُكُمْ بِهِ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ } (الانعام)

”جب تم کوئی بات کہو تو انصاف کرو چاہے وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو یہ ہے وہ بات کہ جس کی اللہ نے تمہیں وصیت کی ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کر سکو۔“

اور پھر یہ بات بھی ضروری ہے کہ جو کچھ اس کے حق میں یا اس کے خلاف کہا گیا ہے ’ دونوں باتوں کا ذکر کیا جائے ’ صرف غلطیوں کو چن چن کر ذکر نہ کیا جائے ’ ایسا کرنا ظلم ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہ ہوں گے ’ آخرت میں نیکی اور بدی دونوں پیش کی جائیں گی اور جس کا پلہ بھاری ہو گا اس کے مطابق حکم لگایا جائے گا۔

ایک اور بات بھی ضروری ہے کہ مخالف کے طریق کار ’ اس کے اسلوب اور کتابوں ’ خطبوں اور تقاریر میں اس کے الفاظ کا انتخاب جانا جائے ’ یہ عین ممکن ہے کہ وہ جو بات کر رہا ہو ’ بظاہر اس سے مخالفت کی ہو آتی ہو لیکن اس کی کتابوں یا اس کے کلام کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہو کہ اس کا اصل مطلب کیا تھا اور یہ کہ مخالفت کرنا اس کا مقصود نہ تھا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ارشاد فرماتے ہیں:

“ایک سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ متکلم کی طرف غلطی منسوب کی جائے حالانکہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس کی بات کو درست طریقے پر سمجھا جائے اور اس کے اسلوب کلام کو احسن کلام طریق سے تعبیر کی جائے اور اس طرح دو مختلف جگہوں پر اس کی کہی گئی باتوں کو غلطی کی طرف منسوب کرنے سے بچا جائے۔” (۱)

شیخ الاسلام ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

“علماء کے مذاہب کو مطلق طریقے سے سمجھنا اور ان کے اپنے اصولوں اور ضابطوں اور ان کی اپنی تشریح کو نظر انداز کرنا نہایت فتنہ رائے قائم کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔” (۲)

اور یہ بھی فرمایا:

“متکلم کے کلام کی وہی تفسیر کی جائے جو اس کے اپنے کلام ہی سے سمجھ میں آتی ہے اور اس مقصد کے لیے یہاں وہاں ہر جگہ اس کے کلام کا مطالعہ کیا جائے، معلوم کیا جائے کہ کسی خاص لفظ کے استعمال سے وہ کیا مطلب لیتا ہے، ہو سکتا ہے ایک جگہ اس نے ایک بات کہی ہو اور دوسری جگہ اس کا منشا اور مقصد بیان کیا ہو، اور یوں اگر الفاظ و معانی کے بیان میں اس کی عادت اور عرف کی پہچان ہو جائے تو پھر اس کے اصل مقصود کو جاننے میں مدد مل سکتی ہے۔

اگر وہ کسی لفظ کو ان معنوں میں استعمال کرے جو وہ عادتاً نہیں کرتا رہا ہے اور اس لفظ کے استعمال کے وقت اپنی عادت کو ترک کر دے اور پھر اس بنا پر کہ جو وہ اس لفظ کا معنی لیا کرتا ہے، یہاں اس کا الٹ مراد ہے اور یوں اس کے کلام میں تناقض دکھایا جائے پھر یہ بھی مناسب نہیں کہ اس کے کلام کے سیاق و سباق کو چھوڑ کر کوئی ایسا معنی مراد لیا جائے جو اس کی ساری تحریروں کے موافق نہ بنتا ہو، اور اگر ایسا کیا گیا تو یہ اس کے کلام کی تحریف کا مترادف ہوگا، اس کے منشا و مراد میں تبدیلی کا باعث ہوگا بلکہ اس پر افترا پردازی شمار ہوگا۔” (۳)

مندرجہ بالا اقتباسات میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اس منہج کا بیان ہوا ہے کہ مخالفین کے اقوال کو کیسے تنقید کی میزان میں تولد جائے اور اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اگر کسی کلام سے دونوں مطلب یعنی صحیح اور غلط لیے جاسکتے ہوں تو اس کا صحیح مطلب ہی لایا جانا چاہیے جو ایسا نہ کرے وہ خود غلطی پر ہے۔

(۲) اگر مصنف کا کوئی ایسا کلام ملے جو اس کے باقی کلام سے مختلف نظر آتا ہو تو کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دونوں کا ایسا مطلب نکالا جائے جس سے دونوں باتوں میں توفیق کی شکل نکل آئے نہ کہ تناقض کی، اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ اس کے کلام کی تحریف شمار ہوگا، اس کے کلام سے ایسا مطلب نکالنے کا موجب ہوگا جو مصنف کا مقصد و منشا نہ تھا، بلکہ اس پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہوگا۔

(۳) اس جلیل القدر عالم کی جانب سے یہ انتہائی عمدہ قاعدہ بتایا گیا ہے۔ یہ وہ عالم ہیں جو اللہ تعالیٰ

کی طرف سے دکھائی گئی روشنی میں ہر بات کی حقیقت کو دیکھ سکتے ہیں اور پھر ان کے قلم اور ان کی زبان پر وہ نورانی قواعد جاری ہوتے ہیں جو طالبین حقیقت کے لیے مشعل راہ بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے نوازیں اور جنات نعیم میں ان کے درجوں کو بلند فرمائیں۔

حواشی

- (۱) مجموع الفتاویٰ ۱۱۴:۳۱
- (۲) انصار المسلمون علی شاتم الرسول ص ۲۸۷۔
- (۳) الجواب الصحیح ۲۸۸:۲

واسطہ قول سے ہونا چاہیے نہ کہ قائل سے

اگر ہم کسی خاص قول یا مذہب پر حکم لگانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے اس مقصد سے تجاوز کر کے قائل کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے تاکہ کہیں قائل کی وجہ سے ہمارے نکتہ نظر میں ایجابی یا سلبی طور پر کوئی اثر واقع نہ ہو، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ قائل کا شمار اچھے لوگوں میں ہوتا ہے اور پھر وہ ایک غلط بات کہتا ہے کہ جس کی تفسیر یا تشریح اس کے کسی دوسرے قول سے ممکن نہیں ہوتی اور یوں اس قائل کی قدر و منزلت کی بنا پر ہم اس کی غلطی سے صرف نظر کریں یہ اس کی غلطی کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کریں اور ایسا کرنے میں ہم جس نتیجے پر پہنچیں گے وہ درست نہ ہوگا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ قائل ہمارے مخالفین میں سے ہو، ہماری نظر میں بدعتی ہو، لیکن بات صحیح کہتا ہو، تو ہم پھر بھی اس کی درست بات کو قبول کرنے سے کترائیں۔ اس لیے ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ درست علمی تنقید مذکورہ قاعدے کی روشنی ہی میں کی جاسکتی ہے، قرآن کریم سے اس قاعدے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سورۃ النمل میں ملکہ سبا کا یہ قول ذکر کیا گیا:

{ قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِوَةَ أَهْلِهَا أِدْزَلَةً } (النمل: ۳۴)

”اس نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد برپا کرتے ہیں اور اس بستی کے معزز افراد کی تذلیل کرتے ہیں“

اور پھر اللہ تعالیٰ اس کی بات کی تصدیق یوں فرماتے ہیں:

{ وَكَذَلِكَ يَفْعَلُونَ }

”ہاں وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔“

ابن جریر طبری نے ان آیات کی تفسیر میں رقم کیا ہے:

”اللہ تعالیٰ ملکہ سبا کا اپنے درباریوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہنا جب کہ وہ اس کا حکم آجانے پر سلیمان علیہم السلام سے جنگ کرنے پر آمادگی کا اظہار کر رہے ہیں، کہ جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں ”یعنی بزور طاقت“ تو وہاں فساد برپا کرتے ہیں ”یعنی اسے ویران کر دیتے ہیں“ اور پھر وہاں کے معززین کو ذلیل و رسوا کر دیتے ہیں ”یعنی آزاد لوگوں کو غلام بنا لیتے ہیں“

اور یہاں تک اس کا کلام تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، ”اور وہ ایسا ہی کرتے ہیں“ یعنی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جیسے ملکہ سب نے کہا، بادشاہ جب کسی بستی کو بزور طاقت فتح کرتے ہیں تو ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔“ (۱)

شیخ محمد الامین الشنقیطی اپنی تفسیر ”اضواء البیان“ کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

”اگر کوئی بات دلیل کی بنا پر رائج نظر آئے تو ہم اسے بھی رائج قرار دیں گے اور اس میں کسی خاص مذہب یا کسی خاص شخصیت کا تعصب حائل نہیں ہو گا کیونکہ ہم قول کی طرف دیکھتے ہیں نہ کہ اس کے قائل کی طرف ہر کلام میں کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا ہے جو قابل قبول ہو یا قابل رد ہو سوائے نبی ﷺ کے قول کے اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ حق حق ہی ہے چاہے اس کا قائل حقیر کیوں نہ ہو۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ملکہ سبا حالانکہ وہ اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر سورج کی عبادت کیا کرتے تھے لیکن جب اس نے ایک سچی بات کہی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کی اور اس تصدیق میں اس کا کفر مانع نہیں ہوا۔“ (۲)

امام شوکانی کہتے ہیں:

”مجتہد وہ ہے جو یہ نہیں دیکھتا کہ قائل کون ہے؟ بلکہ صرف قول کی طرف دیکھتا ہے اور اگر وہ اقلیت کو چھوڑ کر اکثریت کی طرف اس لیے پیروی کرے کہ وہ کسی جلیل القدر صاحب علم اور صاحب حیثیت شخص کی متابعت کر رہے ہیں تو اسے جان لینا چاہیے کہ ابھی اس کی رگوں میں کچھ عصبیت باقی ہے اور اس میں تقلید کا بھی شائبہ پایا جاتا ہے اور یہ کہ وہ اجتہاد کا حق ادا نہیں کر رہا ہے۔“ (۳)

امام ابن القیم نے جب ابی اسماعیل الہروی کی کتاب ”منازل السائرین بین ایاک نعبد و ایاک نستعین“ کی شرح بیان کی تو انہوں نے دیکھا کہ بعض مقامات پر الہروی نے لغزش کھائی ہے جس کی تاویل ممکن نہیں۔ الہروی وہ شخص ہے جو توحید صفات میں سلف کے مذہب کے قائل ہیں اور نیک کا حکم دینے میں اور بدی سے روکنے میں انہوں نے قابل تعریف اقدام کیے ہیں، لیکن جب وہ جادہ حق سے اتر گئے تو امام ابن القیم یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

”شیخ الاسلام ہمارے حبیب ہیں، لیکن ہمیں حق ان سے زیادہ عزیز ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کہا کرتے تھے: ان کا عمل ان کے علم سے زیادہ بہتر ہے اور انہوں نے بالکل سچ کہا: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور بدعتیوں سے جہاد کرنے میں وہ بہت سرگرم رہے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی نصرت میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا وہ کسی سے مخفی نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ گوارا نہ تھا کہ عصمت کی چادر سوائے اُس صادق و مصدوق کے جو کبھی اپنی خواہش کی بنا پر بات نہیں کرتا کسی اور پر بھی چڑھائی جائے الہروی نے اس باب میں الفاظ اور معنی دونوں اعتبار سے غلطی کی ہے۔“ (۴)

اور پھر وہ ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے لگتے ہیں۔

حواشی

- (۱) تفسیر طبری' ۱۹: ۴۵۴-
- (۲) أضواء البیان' ۶: ۱-
- (۳) أدب الطلب' ۴۳-
- (۴) مدارج السالکین' ۳: ۳۹۴-

انسان کے ذاتی فہم کو شرع کے درجہ میں نہ سمجھنا

یہ بات قطعاً جائز نہیں کہ کسی بھی بشر کے فہم کو اصل دین کا درجہ دے دیا جائے کہ جس پر دوستی اور دشمنی کا انحصار ہو، شریعت کے نصوص سمجھنے میں اس سے مدد لی جاسکتی ہے لیکن اس اعتقاد کے ساتھ کہ یہ اللہ یا اس کے رسول کا حکم نہیں ہے۔

ایک آدمی کے علم، عقل، اخلاص اور طریق کار کی درستگی کے لحاظ سے لوگوں کی سمجھ میں اختلاف واقع ہوتا ہے، پھر بھی وہ بشری فہم کے دائرے میں رہے گا، لوگوں کے لیے وہ لازم قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس کی بنا پر دوستی اور دشمنی کا معیار بنایا جاسکتا ہے۔ دینی مسائل دو طرح کے ہیں:

ایک قسم وہ کہ جہاں صراحت کے ساتھ نصوص موجود ہوں، اور چونکہ نص موجود ہے اس لیے اس کا اتباع کرنا واجب ہوگا اور ایک قسم وہ جس میں نص وارد نہیں ہوئی لیکن ایک عالم نے اس کی تفسیر بیان کی ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے عالم نے اس کی دوسری تفسیر بیان کی ہو، ایسی رائے کا اتباع لازم نہیں ہے، صرف عالم کے فہم سے مدد لی جاسکتی ہے۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

”فصل: اقوال دو طرح کے ہیں، انبیاء کے ثابت شدہ اقوال جو کہ غلطی سے مبرا شمار ہوتے ہیں، ان کے معنی و مطالب کا حق ہونا واضح ہے، پہچاننے والے انہیں پہچانتے ہیں اور جاہل ان سے ناواقف رہتے ہیں۔ یہاں مطلوب یہ ہے کہ انبیاء نے ان اقوال سے کیا مراد لیا تھا۔ تو جو شخص وہ راستہ اختیار کرتا ہے جس سے ان کی مراد پتہ چل سکے تو وہ ہدایت کے راستہ پر ہے، لیکن جس کا ارادہ یہ ہو کہ ان کا قول اس کی اپنی خواہش کے تابع ہو جائے، یعنی اگر اس کے موافق ہو تو قبول کرے وگرنہ رد کر دے اور پھر تاویل کے نام سے ان کے قول کی تحریف کرے حالانکہ وہ بخوبی جانتا ہے کہ جو تاویل وہ کر رہا ہے اس کا اکثر و بیشتر حصہ انبیاء کا مقصد نہیں رہا ہے تو ایسا شخص کلام میں تحریف کا مرتکب ہوتا ہے اور اس تاویل کا طلب گار نہیں ہے جسے راسخین فی العلم جانتے اور پہچانتے ہیں۔“

دوسری قسم وہ اقوال جو انبیاء سے منقول نہیں ہیں۔ انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگ معصوم نہیں ہیں۔ ان کا کلام اسی وقت قبول کیا جائے گا جب ان کا مطلب و منشا واضح ہو جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان میں کتنی خوبی ہے اور کتنی برائی ہے۔ ” (۱)

ایک اور جگہ پر تفصیلاً ذکر کرتے ہوئے کہا کہ لوگوں کے عرف کے مطابق شرع کے تین مطلب ہیں:

وہ شرع جو نازل ہوئی ہے۔

وہ شرع جس کی تاویل کی گئی ہے۔

وہ شرع جس میں تبدیلی کی گئی ہے۔

جہاں تک اللہ کی طرف سے نازل کی گئی شریعت کا تعلق ہے تو وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہے ’یہ وہ شریعت ہے جو پہلے اور بعد میں آنے والے تمام لوگوں پر واجب ہے‘ اللہ کا افضل ترین ولی وہی ہو گا جو کامل طریقے سے اس کی پیروی کرے گا جو اس شریعت کی پابندی نہیں کرتا یا اس میں کیڑے نکالتا ہے یا اس سے خروج کو جائز سمجھتا ہے ’اسے توبہ کی تلقین کی جائے گی‘ اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ واجب القتل ہے۔

اور وہ شریعت جس کی تاویل کی گئی ہے تو اس سے مراد علماء کے اجتہادی مسائل میں ان کی آراء ہیں ’اگر کوئی ان آراء میں کسی امام کی تقلید کر لیتا ہے تو اس کے لیے جائز ہے لیکن کسی ایک امام کے قول کو پکڑ لینا واجب ہے۔ اور وہ شریعت جو تبدیل شدہ ہے تو اس سے مراد ہیں بناوٹی احادیث ’الٹی تفسیرات‘ گمراہ کن بدعات جو شریعت میں داخل کر دی گئی ہیں حالانکہ ان کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسی طرح اس میں الحکم بغیر ما نزل اللہ یعنی ایسے فیصلے کرنا جو اللہ کی نازل کردہ شریعت سے مطابقت نہ رکھتے ہوں بھی داخل ہیں اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان جیسی چیزوں کی اتباع کرے۔ ” (۲)

ابن القیم ارشاد فرماتے ہیں:

”وہ حکم جو نازل شدہ ہے اور واجب الاتباع ہے اور وہ حکم جس کی تاویل یا تفسیر کی گئی ہے جس کی اتباع زیادہ سے زیادہ جائز کہی جاسکتی ہے‘ دونوں میں یہ فرق ہے کہ پہلی قسم میں وہ چیزیں داخل ہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر اتاری ہیں اور جن کے مطابق انہوں نے لوگوں میں فیصلے کیے ہیں اور یہ وہ احکام ہیں کہ ان کے علاوہ اور کسی کا اعتبار نہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ حکم جس کی تاویل کی گئی ہے تو اس سے مراد مجتہدین کے مختلف اقوال ہیں جن کی اتباع واجب نہیں‘ جو ان کی مخالفت کرے اسے کافر یا فاسق قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ ان اقوال کے حاملین خود کہتے ہیں کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہیں بلکہ یہ ہماری آراء پر مبنی اجتہادات ہیں‘ تو جو چاہے انہیں قبول کرے اور تبدیل شدہ حکم سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے اللہ نے نہیں اتارا۔ تو

ایسی چیز کا نافذ کرنا اس پر عمل کرنا یا اس کی پیروی کرنا بالکل جائز نہیں۔ اور ایسا کرنے والا کفر^۱ فسق یا ظلم^۲ ان تینوں درجوں میں سے کسی ایک درجے پر ہوگا۔ ” (۳)

مندرجہ بالا تقسیم سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ تمام دینی مسائل اس نوعیت کے نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر دوستی یا دشمنی رکھی جائے دوستی یا ”ولاء“ کا معیار صرف وہ مسائل ہیں جو قطعی دلائل سے ثابت ہوں^۳ رہے وہ مسائل جن میں علماء نے نصوص سے استنباط کرتے ہوئے اجتہاد کیا ہے تو وہ سارے کے سارے اجتہادی مسائل ہیں جس میں کچھ درست بھی ہو سکتے ہیں اور کچھ غلط بھی اور اسی لیے ان میں مخالفین کی غلطیوں سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے۔

حواشی

(۱) مجموع الفتاویٰ ۴: ۱۹۱۔

(۲) الفتاویٰ ۱۱: ۵۰۷۔

(۳) حاوی الأرواح ص ۲۶۶۔

دینی مسائل کو بشری طبیعت کا لبادہ نہ اڑھانا

لوگوں کے مزاج اشخاص اور علاقوں کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں، لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جلدی سے اثر قبول کر لیتے ہیں اور مزاج کے تیز ہوتے ہیں، کچھ اس کے الٹ ہوتے ہیں یعنی اثر جلدی سے قبول نہیں کرتے اور مزاج کے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ اپنی افتاد طبع کے مطابق مخالفین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کے قائل ہیں اور اسے دین کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ دین میں ولاء و براء (یعنی دوستی یا قطع تعلق) کا مسئلہ ہے اور پھر وہ اپنے اس موقف کے لیے شریعت سے دلیل بھی ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔ حقیقت میں یہ موقف شریعت پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ ایک بشری تقاضے کو شریعت کا نام دینے کا مسئلہ ہے۔

اس کے مقابلے میں دوسری طبع کے لوگ اپنی افتاد طبع کے مطابق اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو پاہل ہوتے دیکھتے ہیں، خود شریعت میں کاٹنا چھانٹی ہوتے ملحوظ کرتے ہیں لیکن وہ حکمت اور سوچ بچار کے بہانے دین کی نصرت سے کتراتے جاتے ہیں یہاں تک کہ دین کے نشانات مٹنے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر یہ لوگ بھی اپنے موقف کی تائید کے لیے شرعی دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن حقیقی شریعت ان دونوں مواقف کے درمیان ہے، ایک مسلمان اپنے اعمال اور تصرفات کو دین کے ضابطوں سے جکڑنے کی کوشش کرتا ہے، جہاں دین آگے بڑھنے کے لیے کہتا ہے وہ آگے بڑھتا ہے، جہاں رکنے کے لیے کہتا ہے وہ رک جاتا ہے، جہاں غصے کے اظہار پر ابھارتا ہے وہاں وہ غصہ دکھاتا ہے، جہاں وہ شیر و شکر ہو جانے کا اشارہ کرتا ہے وہاں سپر ڈال دیتا ہے، جہاں سختی کا مطالبہ کرتا ہے وہاں سخت ہو جاتا ہے اور جہاں نرمی کا تقاضا کرتا ہے وہاں نرم پڑ جاتا ہے۔ میدان جنگ میں کفار اور منافقین کے مقابلے میں سختی کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ ۖ وَكَيْسَ الْمَصِيرُ ۝} (التوبة: ۷۳)

”اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کرو، ان سے سختی سے پیش آؤ، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور کیا ہی برا یہ انجام ہے۔“

اس کے مقابلے میں مومنوں سے نرمی کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

{ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكْعًا سَجِدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِمَّنْ أَثَرُ السُّجُودِ ذَلِكَ مِثْلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمِثْلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ۚ كَذَرِعَ أَخْرَجَ شَطْنُهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيُغَيِّظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۚ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا } (الفتح: ۲۹)

”محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں، آپس میں رحم دل ہیں تو انہیں دیکھو کہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضا مندی کی جستجو میں ہیں ان کے نشان اُن کی چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہیں ان کی یہی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے۔ اس کھیتی کی مانند جس نے اپنا اکھوٹا نکالا پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہو گیا پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا تا کہ ان کی وجہ سے کافروں کو غصہ دلائے ان ایمان والوں اور نیک اعمال والوں سے اللہ نے بخشش کا اور بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔“

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس قسم کے لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں: ”لوگوں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے اخلاق کے لحاظ سے بہت نرم بہت شفیق اور بہت محبت کرنے والے ہوتے ہیں اور ان صفات کی بنا پر اللہ اس کے رسول اور اہل ایمان سے محبت کرتے ہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اپنے مال سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں لیکن اپنی نرم خوئی کی بنا پر فحش کاموں سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں اور ان پر اپنا مال بھی خرچ کرتے ہیں تو تم دیکھو گے کہ وہ حق اور باطل دونوں سے محبت رکھتے ہیں دونوں کو اچھا سمجھتے ہیں اور دونوں کی مدد کرتے ہیں۔ اور اس کے برعکس کچھ لوگوں میں سختی پائی جاتی ہے اور اس بنا پر وہ فحش باتوں سے اجتناب کرتے ہیں اور ان سے نفرت رکھتے ہیں اور اسی طرح وہ لوگوں کو نفع پہنچانے ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کی غلطیوں کو معاف کرنے سے بھی دور رہتے ہیں۔ گویا یہ لوگ حق اور باطل دونوں ہی سے بغض و نفرت رکھتے ہیں دونوں ہی کو جھٹلاتے ہیں اور دونوں کی مدد کے روادار نہیں ہیں بلکہ دونوں کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔“ (۱)

چنانچہ پہلی قسم کے لوگ اپنی نرم خوئی اور شفقت کی بنا پر اس معیار یا میزان سے محروم ہو گئے کہ جس سے حق اور باطل خیر اور بشر میں تمیز کی جاسکے اور اپنی اس نرم روی کی وجہ سے دونوں کو ہی قبول کرتے نظر آتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہی اچھے اخلاق کی نشانی ہے ایسے لوگ بعض دفعہ باطل کی تعریف کرتے بھی نظر آئیں گے اور اس کی امداد بھی تو جو شخص ان کا ہم نوا ہوتا ہے وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ غلط ہیں ان کی غلطی سے چشم پوشی کرتا ہے۔

رہے دوسری قسم کے لوگ تو وہ اپنی اور اپنی طبعی قساوت کی بنا پر تمام لوگوں سے سختی سے پیش آتے ہیں چاہے وہ نیک ہوں یا بد ' نیک شخص کا احترام نہیں کرتے اور گنہگار پر رحم نہیں کرتے ' اگر کوئی ان کی مخالفت کرے تو وہ اسے ایذا پہنچائیں گے اور سمجھیں گے کہ وہ اس طرح اللہ کا قرب حاصل کر رہے ہیں ' اس لیے شرعی احکام کو بشری طبائع سے خلط ملط کرنا ' خاص طور پر مخالف سے بات کرتے وقت یا اسے نصیحت کرتے وقت ' بالکل درست نہیں ہے۔

حاشیہ

(۱) قاعدة فی المحبة ۱: ۱۳۵۔

علماء کے اقوال پر تعصب نہ رکھنا

بہت سارے احکام میں علماء کے متعدد قول ملتے ہیں اور جس کی وجہ یہ ہے کہ فہم میں اختلاف پایا جاتا ہے، استنباط کے وسائل میں تنوع ہے، ہر دلیل کو مختلف انداز میں سمجھا جاتا ہے۔ نتیجتاً نہ صرف فتاویٰ میں تنوع پایا جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی ان میں سخت اختلاف بھی دیکھا جاسکتا ہے اور پھر ہر عالم کے اپنے ماننے والے ہیں جو اس کے فہم اور استنباط پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

فتاویٰ میں یہ تنوع، امت کی صفوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کا سبب نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی کسی ایک شخص یا کسی ایک قول کی حمایت میں تعصب رکھنے کا سبب ہونا چاہیے کیونکہ فتویٰ انسانی جدوجہد کا ثمرہ ہے جس میں غلطی اور درستگی دونوں کا احتمال موجود ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں سے ایک فتویٰ قطعی طور پر حق ہے، البتہ ظنی طور پر اس کے حق ہونے کا اعتقاد رکھا جاسکتا ہے کیونکہ اگر ایک فتویٰ کو قطعی طور پر حق جان لیا تو ہم اس کے مخالف کو گنہگار سمجھنے پر مجبور ہوں گے اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک عالم کا قول وہ ”شرع“ نہیں ہے جس پر تعصب کیا جائے، پھر یہ بات بھی ہے کہ ایک قول درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی، تو پھر اسی قول پر تعصب کرنا جائز ہوگا جو کتاب و سنت کے موافق ہو اور پھر یہ تعصب قرآن و سنت کے لیے ہو گا نہ کہ کسی عالم کے قول کا۔

علماء کے لیے تعصب کا اظہار امت کے درمیان تفرقہ بازی اور لڑائی کا باعث بنتا ہے کیونکہ ان کی تعداد بے شمار ہے برخلاف کتاب و سنت کے لیے تعصب کرنے کے، کہ وہ امت کو متحد کرنے کا باعث بنتے ہیں کیونکہ کتاب و سنت خود ایک ہیں۔ شیخ الاسلام نے ارشاد فرمایا:

”تو جو شخص رسول اللہ ﷺ کے علاوہ ہر بات میں کسی کی اطاعت واجب قرار دیتا ہے، جو کچھ

وہ کہے اس کی تصدیق کرنا ضروری سمجھتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ دین کی جو بھی بات کر رہا

ہے اس میں معصوم ہے، غلطی سے مبرا ہے تو ایسے شخص نے اپنے اس مدوح کو رسول

اللہ ﷺ کی رسالت میں برابر سمجھ لیا، اور ہمیں اس سے غرض نہیں کہ کس کے بارے میں

ایسا اعتقاد رکھتا ہے، وہ چاہے کوئی صحابی ہو، یا نبی کا قرابت دار ہو، امام ہو، شیخ ہو یا بادشاہوں

میں سے کوئی بادشاہ ہو یا کوئی اور شخص ہو۔“ (۱)

اس لیے کسی ایک عالم کے قول پر تعصب رکھنا اور اس کے مخالف سے دشمنی رکھنا ایک مسلمان کا شیوہ نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے کا مطلب ہے کہ اس عالم کو معصوم قرار دیا جا رہا ہے۔ ایک مسلمان کا متہائے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ اس قول کی اتباع کرے جو دلیل پر مبنی ہو نہ کہ اس لیے کہ وہ اس کے اپنے عالم کا قول ہے۔ امت کے علماء ہمارے سب کے علماء ہیں ہم ان کے لیے دعا کرتے ہیں اور دلیل کے سمجھنے میں اور احکام کی وضاحت میں ان کے اقوال سے مدد لیتے ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک پر تعصب نہیں کرتے اور اگر کسی کے فہم پر اعتماد کرتے ہیں تو اس کے مخالف کو گمراہ نہیں تصور کرتے اور وہ مسائل جن میں کوئی دلیل وارد نہیں ہوئی بلکہ وہ دلائل سے مستنبط کیے گئے ہیں تو ان میں غلطی اور صحت دونوں کا امکان ہے بلا لحاظ وجہ استنباط کے۔

حاشیہ

(۱) جامع الرسائل ۱: ۲۷۳۔

قول اور فعل کے نتائج کا لحاظ رکھنا

اللہ تعالیٰ نے مصالح کے حصول اور مفاسد کی بچ کئی کے لیے شریعتیں نازل کیں اور احکامات بھیجے، اس لیے ایک طالب علم اور داعی کے لیے ضروری ہے کہ بات کرنے سے یا کسی عمل کو کر گزرنے سے پہلے یہ خوب سوچ لے کہ اس قول یا فعل کے نتائج کیا ہوں گے۔ اگر اسے یقین ہو یا غالب گمان ہو کہ ایسا کرنے سے کوئی اچھی چیز برآمد ہوگی تو اس کے لیے یہ بات کرنا یا یہ فعل عمل میں لانا جائز ہوگا لیکن اگر اسے نہ یقین ہو نہ گمان غالب ہو کہ ایسا کرنے سے بھلا ہوگا بلکہ اس کے برعکس کسی شر کے برآمد ہونے یا کسی خیر کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر اسے نہ یہ بات کہنی چاہیے اور نہ ہی یہ فعل عمل میں لانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

{وَلَا تَسْبُوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسْبُوا اللَّهَ عَدُوًّا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط}

(الانعام: ۱۰۸)

”اور گالی مت دو ان کو جن کی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں کیونکہ پھر وہ براہِ جہل حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے۔“

شیخ الاسلام اس قاعدے کو ”دینی امور میں موازنہ سے“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”جب مصالح اور مفاسد اور نیکی اور بدی میں تعارض ہو، تو پھر جس کا پہلو غالب ہو اسے ترجیح دی جائے گی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا عموماً مصلحت کے حصول اور مفاسدات کے دور کرنے کے لیے ہوتا ہے لیکن اس میں بھی نتائج کو دیکھا جاتا ہے اور اگر ایسا کرنے سے مصلحت ضائع ہو جانے کا اور مفاسدات قائم رہنے کا اندیشہ ہو تو پھر ایسا کرنا بالکل ناجائز ہوگا یعنی اگر مصلحت کے مقابلے میں مفاسدات غالب آنے کا خطرہ ہو تو پھر ایسا کرنا سرے سے حرام ہوگا۔“

انہوں نے ”نیکی اور بدی دونوں میں تعارض (ٹکراؤ) یا دونوں کے ایک ساتھ جمع ہونے“ کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ:

”دو جگہوں پر بدی کو برداشت کیا جائے گا؟ اگر اس بدی سے اس سے بڑھ کر کسی برائی کو ہٹایا جا رہا ہو، یا اس بدی کے برداشت کرنے سے کوئی ایسا فائدہ حاصل ہو جو صرف اس بدی کے باقی رہنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے اور اسی طرح نیکی کو ان دو صورتوں میں چھوڑا جائے گا اگر اس کے باقی رہنے سے کسی بڑی نیکی سے انسان محروم ہو جائے یا اس نیکی کی بنا پر کوئی ایسا نقصان لازم آئے جو اس نیکی کے مقابلے میں بہت بڑا ہو، اس قاعدے کو دینی امور میں موازنہ کرنے سے تعبیر کیا جائے گا۔“

پھر فرمایا: ”عاقِل شخص وہ نہیں ہے جو شر کے مقابلے میں خیر کو جانتا ہو“ بلکہ عاقِل وہ ہے جو دو امور خیر میں سے بہتر کو اور دو امور بد میں سے بدتر کو جانتا ہو“ ایک شاعر کہتا ہے:

ع ان اللیب اذا بدا من جسمه مرضان مختلفان داوی الا خطراء
”عقل مند وہ ہے کہ اگر اس کے اپنے جسم میں دو بیماریاں ظاہر ہوں تو وہ ان میں سے زیادہ خطرناک بیماری کا علاج پہلے کرے گا۔“

پھر وہ ارشاد فرماتے ہیں:

”اگر دو حرام چیزیں ایسے جمع ہوں کہ ان میں سے بدتر سے بچنے کے لیے کم تر کا ارتکاب

ضروری ہو تو پھر ایسی صورت میں کم تر برائی کا ارتکاب کرنا حرام نہ ہوگا۔“ (۱)

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”اے عائشہ! اگر تمہاری قوم کے شرک پر زیادہ زمانہ نہ گزرا ہوتا تو میں کعبہ کو (یعنی کعبہ کے دروازہ کو) گرا کر زمین کے برابر کر دیتا اور اس کے دو دروازے اور بنادیتا“ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی اور کعبہ کی جسامت میں حجر (اسماعیل علیہ السلام) کے چھ ہاتھ برابر اضافہ کر دیتا کیونکہ قریش نے کعبہ کو دوبارہ بناتے وقت اتنا حصہ چھوڑ دیا تھا۔“ (۲)

امام بخاری حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت درج کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اپنا آخری حج ادا کر رہے تھے تو انہیں منیٰ کے قیام کے دوران کچھ لوگوں کی یہ بات پہنچی کہ اگر عمر فوت ہو گئے تو میں فلاں شخص کی بیعت کروں گا“ کیونکہ اللہ کی قسم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک ہو گئی تھی اور پوری بھی ہو گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصے میں آگئے اور کہنے لگے: ”میں ان شاء اللہ آج شام لوگوں سے خطاب کروں گا اور ان لوگوں سے محتاط رہنے کے لیے کہوں گا جو لوگوں کے حقوق غصب کرنا چاہتے ہیں۔“ یہ سن کر عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: یا امیر المؤمنین! ایسا نہ کیجیے کیونکہ موسم حج میں ہر قسم کے لوگ جمع رہتے ہیں“ انتظار کیجیے یہاں تک کہ آپ مدینہ منورہ واپس پہنچ جائیں“ مدینہ ہجرت اور سنت کا گھر ہے“ وہاں آپ شرفاء اور سمجھ دار لوگوں کو جمع کر کے اپنے دل کی بات اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں“ اہل علم آپ کی بات کو خوب سمجھیں گے اور اسے درست معنوں میں لیں گے“ تو حضرت عمر نے کہا: ”اللہ کی قسم! اگر ایسی بات ہے تو میں ان شاء اللہ مدینہ پہنچتے ہی یہ کام کر گزروں گا۔“ (۳)

تو یہ بات واضح ہو گئی کہ ایک طالب علم کو ہمیشہ نتائج پر نظر رکھنی چاہیے یعنی اگر ایسا کروں گا تو اس کے نتیجے میں کیا رد عمل ہو سکتا ہے اور یہ بات ہر انسان کے بس کی نہیں“ اس کی توفیق اسی شخص کو ہوتی ہے جو گہرا علم رکھتا ہو“ اس کا دائرہ و معلومات وسیع ہو“ نئے نئے معاملات میں علماء کے اقوال اور ان کے موقف کو بخوبی جانتا ہو“ اور پھر ان

میں سے بہترین اور درست ترین کو خوب پہچانتا ہوا اور یوں اس کے لیے صحیح بات کہنے کی توفیق عطا ہو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

{وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ} (فُصِّلَتْ: ۳۵)
 ”اور یہ بات انہی کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کریں اور اسے وہی پاسکتا ہے جو بہت بڑے نصیب والا ہو۔“

حواشی

- (۱) الفتاویٰ ۲۰: ۵۳، ۶۱
- (۲) صحیح البخاری (۱۵۰۹) صحیح مسلم (۴۰۱) الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔
- (۳) صحیح البخاری (۶۴۴۲)

غلط اجتہاد پر مجتہد کی غلطی معاف کی جاتی

ہے

مسلمان اس بات کے محتاج ہیں کہ اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی ﷺ کی سنت کو سمجھ سکیں اور اسی طرح اس بات کے بھی محتاج ہیں کہ اعتقادی اور عملی مسائل دین کا بھی ادراک کر سکیں، امت کا ہر مسلمان یہ کام خود نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے اس بات کا مکلف قرار دیا گیا ہے، اس لیے مسلمانوں ہی میں سے ایک جماعت کو اس کام کے لیے فارغ ہونا انتہائی ضروری ہے اور یہی لوگ اس بات کے مکلف ہیں کہ شرعی نصوص کو پوری طرح سمجھ کر ان احکامات کو پہچان سکیں، اور جب ایسا ہی کوئی عالم ان امور میں اجتہاد کرتا ہے اور اپنے اجتہاد میں پوری پوری محنت صرف کرتا ہے تو یا تو وہ حق بات کا ادراک کر لیتا ہے اور یا پھر غلطی کر بیٹھتا ہے۔

اگر وہ اپنے اجتہاد میں حق و راستی کو پا گیا تو دہرے اجر کا مستحق ہوگا اور اگر غلطی کر بیٹھا تو پھر بھی وہ ایک اجر کا مستحق ہوگا، اس پر کوئی وبال نہ ہوگا۔ اپنے اجتہاد میں غلطی کر بیٹھنے کے لیے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے اللہ عز و جل اسے معاف فرمائیں گے۔ (۱)

یہی مذہب ہے اہل سنت والجماعت کا جس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔ متکلمین میں سے معتزلہ اور اشاعرہ اور چند اور گروہ بھی، فروعی مسائل میں غلطی کرنے پر کہ جسے وہ بعض اوقات ظنی امور سے تعبیر کرتے ہیں، اس رائے میں اہل سنت والجماعت کے ساتھ ہیں لیکن اصولی مسائل میں کہ جسے وہ قطعی امور یا عقائد کہتے ہیں، وہ ان کے مخالف ہیں۔ ہم یہاں اہل سنت والجماعت کے مذہب کی تائید میں قرآن و سنت کے دلائل پیش کریں گے اور اس ضمن میں اہل علم کی آراء بھی نقل کریں گے۔ اللہ عز و جل ارشاد فرماتے ہیں:

{لَا يَكْلَفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَيَّ

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۖ وَاعْفُ عَنَّا ۖ وَاعْفِرْ لَنَا ۖ
وَارْحَمْنَا ۚ أَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝} (البقرة: ۲۸۶)

”اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جو نیکی کرے وہ اس کے لیے اور جو برائی کرے اس کا وبال اس پر ہے اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کریں تو ہمیں نہ پکڑنا اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو اور ہم سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر! تو ہی ہمارا مالک ہے اور ہمیں کفار پر غلبہ عطا فرما۔“

یہ آیت اس قول ربانی کے بعد نازل ہوئی:

{لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ
يُحٰسِبْكُمْ بِهٖ ۗ اللّٰهُ ۙ فَيَغْفِرْ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ۝} (البقرة: ۲۸۴)

”آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ ہی کی ملکیت ہے تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے تم ظاہر کرو اور چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کا حساب تم سے لے گا پھر جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

امام مسلم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: جب

یہ آیت اتری:

{وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحٰسِبْكُمْ بِهٖ ۗ اللّٰهُ ۙ}

”چاہے جو کچھ تمہارے نفس میں ہے تم اسے ظاہر کر دیا چھپاؤ اللہ تمہارا محاسبہ کرے گا“
تو انہیں ایسی فکر لاحق ہوئی جو پہلے کبھی نہ لاحق ہوئی تھی تو نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:
”کہو کہ ہم نے سنا ہم نے اطاعت کی اور ہم جھک گئے۔“

کہا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان جاگزیں کر دیا اور پھر یہ آیات نازل کیں:

{لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا
تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِينَا اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ}

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”میں نے ایسا کر دیا (یعنی ان کی دعا قبول کی)“

اور پھر جب اہل ایمان نے مزید دعا کی:

{رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۙ}

تو پھر کہا: ”میں نے ایسا کر دیا۔“ (۲)

امام ابن تیمیہ ارشاد فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کا اہل ایمان کی دعا کے بعد یہ کہنا کہ ”میں نے ایسا کر دیا“ یہاں مسئلہ چاہے قطعی ہو یا ظنی اس میں غلطی ہو جانے میں فرق نہیں روارکھا اور یہ بات معلوم ہے کہ ظنی اسے کہا

جانتا ہے کہ جہاں غلطی ہونے کے بارے میں وثوق سے نہ کہا جاسکے، اسی لیے اہل سنت کا یہ مذہب ہے کہ یہ کہنا کہ کسی قطعی یا ظنی مسئلہ میں غلطی کرنے والا گنہگار ہے تو وہ کتاب سنت اور قدیمی اجماع کا مخالف ہے۔ ”...“ اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ کسی مسئلہ کا قطعی ہونا یا ظنی ہونا وہ معتقد کے حال کے مطابق ایک اضافی امر ہے نہ کہ قول کا اپنا ذاتی وصف ” (۳)

اور امام ابن تیمیہ غلطی کرنے والے مجتہد کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

”ہو سکتا ہے وہ شرع میں تاویل کرنے والا ہو تو پھر اسے اجتہاد میں غلطی کرنے کے اعتبار سے معاف کیا جائے گا بلکہ اجتہاد کرنے پر ثواب بھی دیا جائے گا البتہ اس امر میں اس کی پیروی ناجائز ہوگی۔“ (۴)

شیخ الاسلام نے امام رازی پر تنقید کرتے ہوئے اور ان کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے جیسے ضابطہ نمبر چھ میں گزر چکا ہے ارشاد فرمایا:

”جس انسان سے غلطی واقع ہو“ اور وہ اس سے آگے جانے کی قدرت نہ رکھتا ہو (یعنی اس کی سمجھ سے باہر ہو) اور پھر وہ اس کے ازالہ پر بھی نہ قادر ہو تو پھر اس کے لیے یہ وہ عذر ہو گا چونکہ اس نے پوری طرح اجتہاد کیا ہے تو اللہ اسے عذاب نہ دے۔“ (۵)

اور پھر ارشاد فرمایا:

”کئی عابد عالم بلکہ حاکم اجتہاد کرنے کی بنا پر اپنے فعل میں معذور سمجھے جائیں گے چونکہ اصل مقصود یہ ہے کہ وہ صحیح دلیل کو سمجھیں اگر وہ اسے چھوڑتے بھی ہیں تو اپنے اجتہاد کی بنا پر معذور شمار ہوں گے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ مرتبہ صدیقیت پر فائز ہوں کیونکہ صدیق کی شرائط میں سے یہ نہیں ہے کہ اس کا قول ہمیشہ صحیح ہو اور اس کا عمل ہمیشہ سنت ہو کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اللہ کے رسول ﷺ جیسا ہو گا اور یہ باب بہت وسیع ہے (یعنی اس بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے)۔“ (۶)

میلاد منانے کی بدعت کے بارے میں کہتے ہیں:

”مولد نبوی کو بڑا جانا اور اس کو منانا جیسا کہ کچھ لوگ کرتے ہیں باعث اجر بھی ہو سکتا ہے اگر کرنے والے کا قصد اچھا ہو اور وہ نبی ﷺ کی تعظیم کے ارادے سے ایسا کر رہا ہو جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ بعض دفعہ ایک چیز جو راست یافتہ مؤمن کے لیے تو اچھی نہ شمار ہوگی لیکن ایک عام آدمی سے اچھی سمجھی جائے گی۔“ (۷)

اور ابن القیم کہتے ہیں:

”جو شخص شرع کا اور حالات حاضرہ کا علم رکھتا ہے بخوبی جانتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو خدمت اسلام میں معروف و مشہور ہو اور اپنے نیک کاموں کی وجہ سے پہچانا جاتا ہو وہ اگر پھسل بھی جائے تو اسے معذور سمجھا جائے گا بلکہ اپنے اجتہاد کی بنا پر اسے اجر کا مستحق بھی گردانا جائے گا لیکن اس معاملے میں اس کی پیروی نہیں کی جائے گی اور یہ جائز نہیں ہو گا کہ لوگوں کے دلوں سے اس کے رتبے اس کی شان اور اس کی امامت کو گھٹا دیا جائے گا۔“ (۸)

شاطبی کہتے ہیں:

”اگر عالم سے بھول ہو جائے تو نہ اس پر ایک لحاظ سے بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی تقلید کی جاسکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس پر کوتاہی کا الزام نہ لگایا جائے نہ ہی اسے برا بھلا کہا جائے نہ ہی اس کی بے قدری کی جائے اور نہ ہی یہ اعتقاد رکھا جائے کہ وہ مخالفت پر آمادہ ہے ایسا کرنا دینی لحاظ سے اس کے رتبے کو دیکھتے ہوئے مناسب نہیں ہے۔“ (۹)

ابن تیمیہ کہتے ہیں:
”اگر ایک عالم اپنے فتاویٰ کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہو اور ایک سو مسائل میں اس سے غلطی سرزد ہو جائے تو اسے عیب نہیں کہا جائے گا۔“ (۱۰)

سعید بن المسیب کہتے ہیں:
”آدمی چاہے شریف ہو، عالم ہو، صاحب سلطان ہو، اس میں کوئی نہ کوئی عیب تو پایا جائے گا لیکن بعض لوگوں کے عیوب ذکر نہیں کیے جاتے جس شخص کی فضیلت اس کی کوتاہیوں کے مقابلے میں زیادہ ہو تو اس فضیلت کی بنا پر اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی برتی جائے گی۔“

ابن حجر کہتے ہیں:
”علماء کا کہنا ہے ہر تاویل کرنے والا اپنی تاویل کی بنا پر معذور قرار دیا جائے گا اگر اس کی تاویل عربی زبان کے لحاظ سے قابل قبول ہو اور عملی اعتبار سے اس کی توجیہ کی جاسکتی ہو تو وہ گنہگار نہ ہوگا۔“ (۱۱)

غلطی کرنے والے مجتہد کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا یہی مذہب ہے۔ لیکن متکلمین میں سے معتزلہ اور اشاعرہ اس بات میں مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اصول یعنی عقائد میں مجتہد اگر اپنے اجتہاد میں درست پایا جائے تو وہ اجر کا مستحق ہوگا لیکن اگر غلطی کر بیٹھے تو گنہگار ہوگا کیونکہ غلطی کے ساتھ گناہ کا ہونا ان کے نزدیک لازمی ہے۔

ابن تیمیہ نے اپنے ایک مستقل مضمون میں ان کے اقوال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

”لوگوں کا اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہے کہ مجتہدین کو اصولی و فروعی مسائل میں غلطی کر بیٹھنے پر گناہ ہوگا یا نہیں ہم اس ضمن میں چند جامع اور مفید اصول بیان کریں گے۔“

پہلی بنیاد: سوال یہ ہے کہ کیا ہر شخص کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ہر نزاعی مسئلہ میں اپنے اجتہاد کی بنا پر حق کو پہچان لے؟ اگر اسے حق معلوم نہ ہو پھر وہ اجتہاد کرے اپنی تمام طاقت صرف کر ڈالے پھر بھی حق تک نہ پہنچ پائے اور پھر یوں کہے کہ جو میں اعتقاد رکھتا ہوں وہی نفس الامر میں حق ہے حالانکہ وہ حقیقی طور پر درست نہ تھا تو آیا ایسے شخص کو سزا دی جائے گی؟ یہ ہے

اصل مسئلہ کہ جس کے بارے میں اہل علم کے تین قول ہیں اور ہر قول ایک نہ ایک گروہ سے منسوب ہے۔

پہلا قول ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسئلہ میں حق بات پر ایک دلیل رکھ دی ہے جس سے حق کی پہچان ہو جاتی ہے اور اگر مجتہد پوری صلاحیت کے ساتھ اجتہاد کرے تو وہ اس حق کو پہچان لیتا ہے اور جو شخص بھی کسی بنیادی یا فروعی مسئلہ میں حق کو پہچان نہیں سکا ہے تو وہ عجز کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی کوتاہی کی بنا پر اس حال کو پہنچا ہے۔

اس قول کے قائل قدریہ (تقدیر کے منکر) معتزلہ اور کچھ دوسرے متکلمین ہیں۔ اور ان لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ علمی مسائل پر قطعی دلائل رکھے گئے ہیں جس سے ان کی پہچان ہوتی ہے اور اگر مجتہد ان کو نہ پاسکے تو اس نے حق کو پہچاننے میں اپنی پوری طاقت صرف نہیں کی ہے اس لیے وہ گنہگار ہوگا۔

باقی رہے عملی مسائل تو اس میں بھی دورائے ہیں:

پہلی تو وہی ہے جو علمی مسائل کے ضمن میں بیان ہوئی ہے کہ ہر مسئلہ پر ایک قطعی دلیل رکھی گئی ہے اور جو شخص اس کی مخالفت کرے گا وہ گنہگار ہوگا۔ یہ لوگ صاف صاف کہتے ہیں کہ ہر بنیادی اور فروعی مسئلہ میں ایک ہی شخص درست ہو سکتا ہے اور اس درست شخص کے علاوہ ہر دوسرا گنہگار ہے کیونکہ اس سے غلطی کا ارتکاب ہوا ہے اور ان لوگوں کے نزدیک غلطی کرنے پر گناہ کا ہونا لازم ہے۔

یہ قول بشر المرئسی اور بغداد کے اکثر معتزلہ کا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ عملی مسائل میں اگر کوئی قطعی دلیل پائی جائے اور پھر کوئی اس کی مخالفت کرے تو وہ غلطی پر ہے اور گنہگار ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے علمی مسائل کے بارے میں کہا گیا اور اگر ان پر کوئی قطعی دلیل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں کوئی حکم سرے سے نہیں دیا بلکہ ہر مجتہد اپنے اجتہاد کے مطابق جو بھی فیصلہ کرے وہی اللہ تعالیٰ کا حکم شمار ہوگا۔

یہ رائے رکھنے والے پہلے والوں کے ساتھ اس بات میں تو موافقت رکھتے ہیں کہ غلطی اور گناہ لازم و ملزوم ہیں اور یہ کہ ہر غلطی کرنے والا گنہگار ہے لیکن اجتہادی مسائل میں کوئی دلیل نہیں ہے اسے تو صرف میلانِ نفس سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ گویا ظنی اعتقاد ارادے کی طرح ہے ان کی رائے میں ایسے امور میں اجتہاد کے ذریعہ کسی حکم تک پہنچنے کا مطالبہ ہی نہیں کیا گیا۔

یہ قول ابوالمذیل العلاف اور اس کے پیروکاروں میں سے الجبائی اور اس کے بیٹے کا ہے۔ اشعری کے بھی دو اقوال میں سے مشہور یہی قول ہے اور اسی قول کو قاضی باقلانی ابو حامد غزالی اور ابو بکر بن العربی نے اختیار کیا ہے۔ ہم نے اس بارے میں کئی جگہوں پر مفصل کلام کیا ہے۔

اس قول کی مخالفت کرنے والوں میں اشاعرہ میں سے ابواسحق الفرائینی اور دوسرے

حضرات ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس قول کا آغاز سفسطہ اور انتہاءِ زندقہ ہے (یعنی شروع میں بے معنی کلام ہے اور آخر میں کفریہ بات ہے) یعنی یوں کہنا کہ عملی مسائل میں اجتہاد کرنے والا ہر مجتہد ظاہری اور باطنی دونوں لحاظ سے درست ہے، ان کے نزدیک ایک مجتہد غلطی پر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض باتیں اس کی نظر سے اوجھل رہی ہوں، اور ایسی باتیں وہ اس کے حق میں یا اس جیسے دوسرے لوگوں کے حق میں اللہ کا حکم شمار نہیں ہوتیں۔ صرف وہ قطعی مسائل میں غلطی کرنے کی بنا پر گنہگار ہوگا۔

اس مسئلہ میں دوسرا قول یہ ہے کہ مجتہد اپنے اجتہاد کے نتیجے میں حق کو پہچان بھی سکتا ہے اور اس سے عاجز بھی رہ سکتا ہے، لیکن اگر عاجز رہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ اسے سزا دے یا نہ دے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کی بنا پر کسی بھی شخص کو بغیر سبب کے بھی عذاب دینا چاہیں تو عذاب دے سکتے ہیں اور معاف کرنا چاہیں تو معاف کر سکتے ہیں۔ یہ قول جہمیہ اور اشاعرہ کا ہے اور اس طرح بہت سے فقہاء اور ائمہ اربعہ کے پیروکاران اور کئی دوسرے حضرات کا ہے۔ (۱۲)

اور پھر انہوں نے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، اہل سنت والجماعت کے مذہب کا ذکر کیا ہے۔ تو یہ ہیں متکلمین کے اقوال کہ جن سے انہوں نے مذہب سلف کی مخالفت کی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رائج مذہب اہل سنت والجماعت کا ہی ہے کہ جو قرآن و سنت کے دلائل پر قائم ہے کہ جس کے مطابق غلطی کرنے والے مجتہد کو بھی معذور قرار دیا گیا ہے بلکہ اسے اجتہاد کی بنا پر ایک درجہ اجر کا مستحق بھی قرار دیا گیا ہے اور درست رائے تک نہ پہنچنے میں اسے قابل معافی گردانا گیا ہے۔ اور یہی رائے صاحب رائے ہے کہ جس کی بنا پر امت میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے اور لوگوں کے دل اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی طرف بلاتے ہیں ضروری ہے کہ وہ اس ربانی منہج کی پیروی کریں جو فطرت کے قریب ہے اور امت کو جوڑ سکتا ہے۔

حواشی

(۱) ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان اسباب کو اپنی قابل فخر کتاب ”رفع الملام عن الائمة الاعلام“ میں جمع کر دیا ہے اور اس کتاب میں ائمہ اربعہ ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا دفاع کیا ہے اللہ جنات نعیم میں ان کے رہتوں کو بلند فرمائے۔

(۲) مسلم حدیث نمبر ۲۱۶۔

(۳) منہاج السنۃ ۵: ۹۱

(۴) اقتضاء الصراط المستقیم ص ۲۶۸۔

(۵) الفتاویٰ ۵: ۵۶۱-۵۶۳

(۶) ایضاً ص ۲۸۲ اور ص ۲۹۰، ۲۹۴

(۷) ایضاً ص ۲۹۷ ’ اس کلام کی وضاحت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ بدعت کے دو پہلو ہیں: ”اول: اس پر کسی چیز نے ابھارا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی ﷺ کی محبت ہی اس کا سبب ہے اور یہ دل کا عمل ہے کہ جسے اچھے ارادے اور تعظیم نبی سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کی طرف ابن تیمیہ نے اشارہ کیا ہے اور اسی پر اجر بھی ملے گا۔ دوسرا پہلو عمل کا ہے ’ اس پر اجر کا مستحق نہ ہو گا کیونکہ دین میں نئی بات کا اضافہ کیا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا: “جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی کوئی بات پیدا کرتا ہے جو اس میں شامل نہ تھی تو وہ رد کر دی جائے گی۔” (مسلم حدیث نمبر ۴۵۸۹)

(۸) اعلام الموقعین ۳: ۳۵۹۔

(۹) الموافقات ۴: ۱۷۱۔

(۱۰) أدب الدنيا والدين ص ۷۰۔

(۱۱) فتح الباری ۱۲: ۳۷۶۔

(۱۲) الفتاویٰ ۱۹: ۲۰۳۔

اجتہاد میں غلطی دوستی کو ختم کرنے یا کمزور کرنے کا باعث نہیں ہوتی

اسلام میں داخل ہونا ایسا ہے جیسے اہل ایمان کے ساتھ ایک شرعی معاہدہ کرنا جسے اللہ تعالیٰ نے اخوت کا نام دیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے چاہے وہ گنہگار اور نافرمان کیوں نہ ہو، گناہ کی وجہ سے یہ تعلق منقطع نہیں ہو جاتا چاہے اس کا مرتکب بدعتی ہی کیوں نہ ہو، لایہ کہ اس کی بدعت کفر صریح تک پہنچ جائے جو ملت سے باہر کر دے۔ ایمان کا یہ تعلق بہت ہی عظیم تعلق ہے اور ایک مسلمان کو اسے نیچا نہیں سمجھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

{إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلَحُوا بَيْنَ أَخَوِيكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ} (الحجرات: ۱۰)

”بے شک اہل ایمان بھائی بھائی ہیں تو پس بھائیوں میں صلح کرو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحمت ہو سکے۔“

اور نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہ ہو گا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔“ (۱)

ابن الصلاح لکھتے ہیں:

”تم میں سے کسی شخص کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اسلام کے تقاضے سے اس کے لیے وہی کچھ نہ پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے، یعنی اسے بھی وہ کچھ حاصل ہو جو اسے حاصل ہے لیکن اس طرح کہ اس کے ساتھ کوئی مقابلہ نہ ہو، اور اسے بھی وہ نعمت ملے جو اسے ملی ہوئی ہے لیکن اسے خود گھٹانا نہ ہو، ایک قلب سلیم کے لیے یہ بات آسان ہے لیکن کینہ پرور کے لیے بڑی مشکل ہے، اللہ ہمیں ایسی خصلت سے دور رکھے۔“ (۲)

کرمانی کہتے ہیں:

”اور ایمان کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جو بری بات اپنے لیے ناپسند کرتا ہے وہ اپنے بھائی کے لیے بھی ناپسند رکھے، گو اس بات کا ذکر نہیں کیا لیکن ایک چیز کو پسند کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اسے اس کی الٹ چیز ناپسند ہو، اس لیے پہلی بات کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔“ (۳)

تو جو شخص اپنے بھائی کے لیے اچھی بات پسند کرے اور بری بات ناپسند کرے تو ایسا شخص اس کے حق میں کوئی بر اکام نہیں کرتا بلکہ اس سے محبت رکھتا ہے۔ اس کی اچھی باتوں کی تعریف کرتا ہے اور یہ ایمان کا تقاضا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ضرورت کے وقت نہ اس پر تنقید کرے اور نہ نصیحت کرے۔

اخوت اور بھائی چارے کی یہ شرط نہیں ہے کہ وہ کسی گناہ یا بدعت میں ملوث نہ ہو، البتہ اس کے گناہ یا بدعت کے برابر اس کی محبت میں کمی آجائے گی، لیکن اخوت اسلام باقی رہے گی جو اس کی اطاعت میں کوتاہی یا معصیت میں مبتلا ہونے کی بنا پر منقطع نہ ہوگی۔ اجتہاد میں غلطی کی بنا پر دوستی میں کمی یا کمزور نہیں آنی چاہیے کیونکہ اجتہاد میں غلطی معاف کی گئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہمیں یہ کہنا سکھایا ہے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن تَسِينَا أَوْ أَخْطَاْنَا
”اے ہمارے رب اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کریں تو ہمیں مت پکڑنا“
اور پھر اللہ تعالیٰ نے کہا: ”میں نے ایسا ہی کیا۔“

اللہ عز و جل تو خطا کرنے والے کا مواخذہ نہیں کرتے بلکہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق اسے اس کے اجتہاد پر اجر سے نوازتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا:

”جب حاکم ایک فیصلہ کرتا ہے اور اس بارے میں اجتہاد کرتا ہے اور اپنے اجتہاد میں صحیح رائے تک پہنچتا ہے تو اسے دو اجر ملتے ہیں لیکن اگر اپنے اجتہاد میں غلطی بھی کر بیٹھتا ہے تو اسے ایک اجر ملتا ہے۔“ (۴)

اب ہمارے لیے یہ کیسے مناسب ہو گا کہ ہم اسے اس حق سے محروم کر دیں جو ہم پر واجب ہوتا ہے یعنی اس سے دوستی رکھنا یا اس حق میں کوتاہی کریں۔ ابوالمظفر الشعمانی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

”اختلاف کی دوسری قسم وہ ہے جو محبت کو زائل نہیں کرتی، نہ ہی آپس میں دوری پیدا کرتی ہے، نہ ہی دوسرے سے براءت پر آمادہ کرتی ہے اور نہ ہی اسلامی اخوت کو ختم کرتی ہے، یعنی نئے نئے معاملات میں اختلاف کا واقع ہونا کہ جہاں مسئلہ فروعی ہو، کوئی نقص موجود ہو، دلائل پوشیدہ ہوں اور پھر کسی رائے تک پہنچنے کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہو۔“ (۵)

اجتہاد میں خطا کے بارے میں ہمارے یہ دو موقف ہیں:

- (۱) ہم مجتہد کی غلطی کی پیروی نہ کریں بلکہ اسے صحیح بات بتائیں۔
- (۲) ہم اس کے حقوق میں کوتاہی نہ کریں اور وہ یہ ہیں کہ ہم اس سے دوستی رکھیں، محبت رکھیں اور اس کی مدد کرتے رہیں۔

اپنے ایک مسلمان بھائی کہ جس نے اپنے اجتہاد میں غلطی کی ہے، کے ساتھ ہمارا شرعی طور پر یہ موقف ہونا چاہیے اور اگر ہم اس قاعدے پر عمل کرتے تو امت میں وہ بے شمار جھگڑے نہ ہوتے کہ جو دشمنی کی حد تک لے جا کر ایک دوسرے کے حقوق سلب کرنے پر آمادہ کرتے۔

حواشی

- (۱) البخاری، نمبر حدیث ۱۸۷۔ (۲) صحیح مسلم پر النووی کی شرح، ۲: ۱۷۔
 (۳) فتح الباری ۱: ۸۵۔ (۴) البخاری (۶۸۰۵) مسلم (۳۲۴۰)
 (۵) قواطع الأدلة ۲: ۳۰۸۔

تاویل کی غلطی ایک مسلمان کو دین سے خارج نہیں کرتی

قرآن و سنت کی نصوص سمجھنے کے لیے اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں علماء اجتہاد کے محتاج رہے ہیں اور اس بنا پر ان میں اختلاف بھی پیدا ہوتا رہا ہے اور پھر ہر ایک اجتہاد کو قبول کرنے کے ضمن میں گروہ بندیاں بھی پیدا ہوئیں۔ ہر مجتہد نے اپنے درست ہونے اور مخالف کے غلطی پر ہونے کا دعویٰ کیا بلکہ مخالفین پر بدعتی، فاسق اور کافر ہونے کی حد تک الزام عائد کیے اور اس طرح یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہا یہاں تک کہ ہمارے زمانے تک آپہنچا اس زمانے کے لوگوں نے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا اور دوسرے زیادہ ضروری کاموں کو چھوڑ کر انہی اختلافات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

مخالفین پر یہ الزام تراشی حد سے بڑھتی رہی اور دعوت کے میدان میں کام کرنے والوں کی اکثریت نے اس موضوع پر بہت کم سوچ بچار کیا جس کی وجہ سے دائرہ اختلاف بڑھتا گیا اور امت کی صفوں میں انتشار پیدا ہوتا گیا۔ چنانچہ اب یہ بات انتہائی ضروری ہو گئی ہے کہ اس قسم کے الزامات اور احکامات پر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے۔ یہاں ہمیں مخالفین پر کفریہ حکم لگانے کے مسئلہ پر خاص طور پر غور کرنا ہے کیونکہ ایک مخالف پر سب سے زیادہ سنگین الزام یہی ہے۔ پچھلے تمام زمانوں میں جید علماء نے خاص طور پر یہ تنبیہ کی ہے کہ کسی مخالف پر اجتہادی امر میں کفر کا حکم لگانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دین سے خارج ہو گیا ہے بلکہ اس سے مراد عملی کفر ہے نہ کہ اعتقادی کفر۔

اس لیے ہم یہ کہیں گے کہ اجتہادی امور میں مخالفت کرنے والا مسلمان ہی رہتا ہے چاہے کتنی بڑی غلطی کیوں نہ ہو اسے مسلمانوں کے حقوق حاصل رہیں گے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا قائل رہا ہے اور مسلمانوں کی جماعت سے جدا نہیں ہوا ہے۔ یہاں اس ضمن میں ہم علماء کے چند اقوال پیش کریں گے:

(۱) ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ مسئلہ تکفیر کے دو پہلو ہیں: پہلا یہ کہ اس کے ظاہری کفر کو ثابت کیا جائے اور دوسرا یہ کہ اس کے باطنی کفر کو ثابت کیا جائے۔ پھر لکھتے ہیں:

”ہم اس شبہ کو زائل کرنے کے لیے مزید وضاحت کرتے ہیں کیونکہ اکثر فقہاء یہ خیال رکھتے ہیں کہ جسے کافر کہہ دیا گیا تو اس پر مرتد کے احکام جاری کرنا ضروری ہو گئے۔ چنانچہ نہ وہ وارث

ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اس کا وارث بن سکتا ہے، نہ ہی وہ مسلمانوں میں نکاح کر سکتا ہے، یہاں تک کہ اگر کسی نے بدعت کی تاویل کی ہو تو اسے بھی کافر سمجھتے ہیں اور اس پر بھی کفر کے احکام جاری کرنے کے قائل ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔” (۱)

جب ان سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو رافضیوں پر یہود اور نصاریٰ کو افضل قرار دیتا ہے تو انہوں نے کہا:

”الحمد للہ، ہر وہ شخص جو محمد ﷺ پر ایمان لاتا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو ان پر ایمان نہیں لاتا، چاہے ایسے مسلمان میں خارجیوں، شیعہ، مرجئہ اور تقدیر کے منکر لوگوں کی سی بدعت ہی کیوں نہ پائی جاتی ہو، وہ اس لیے کہ یہود اور نصاریٰ کا کافر ہونا، دین اسلام میں اٹل ہے۔ اس کے مقابلے میں بدعتی شخص اپنے آپ کو نبی ﷺ کا مخالف نہیں بلکہ ہمنوا سمجھتا ہے، اگر اسے کافر بھی کہا جائے تو اس کا کفر اس شخص کی مانند نہیں ہے جس نے نبی ﷺ کو جھٹلایا۔” (۲)

اور پھر ارشاد فرمایا:

”مقصود کلام یہ ہے کہ منافق کو چھوڑ کر کسی بھی شخص کے ایک گناہ کے ارتکاب کی بنا پر یا کسی بدعت کے قائل ہونے اور اس کی طرف دعوت دینے کی وجہ سے باطنی طور پر کافر نہ کہا جائے گا، چنانچہ جس شخص کے دل میں اللہ کے رسول اور جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں، پر ایمان ہو لیکن بعض بدعات کی تاویل کرتے وقت غلطی کا شکار ہوا ہو تو وہ سرے سے کافر نہیں کہلایا جا سکتا۔” (۳)

اور یہ بھی کہا:

”اور یہی حکم ہے تمام بہتر فرقوں کا، ان میں سے جو لوگ منافق ہیں وہ تو باطنی طور پر کافر ہیں، لیکن جو منافق نہیں بلکہ باطن میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں، وہ باطنی طور پر کافر نہ قرار دیے جائیں گے چاہے انہوں نے تاویل کی بنا پر کوئی غلطی کیوں نہ کی ہو۔” (۴)

(۲) ذہبی کہتے ہیں:

”اور جو شخص چاہے کتنی ہی بڑی بدعت کی بنا پر کافر قرار دیا جائے وہ حقیقی کافر کی طرح نہیں ہے اور نہ ہی کسی یہودی یا مجوسی کی مانند، اللہ تعالیٰ کبھی نہ چاہیں گے کہ ایک شخص جو اللہ، اس کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، نماز، روزہ، حج ادا کرتا ہو، زکوٰۃ دیتا ہو اور چاہے کتنی ہی بڑی بدعت کا مرتکب کیوں نہ ہو وہ اس شخص کی طرح قرار دیا جائے جو رسول سے دشمنی رکھتا ہو، بتوں کی عبادت کرتا ہو، شریعت کا منکر ہو اور کفر کا مرتکب ہو، ہاں! ہم بدعت اور بدعتیوں سے اللہ کے حضور اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔” (۵)

(۳) ابن الوزیر غلط کار تاویل کرنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {وَلَكِنَّ مَن شَرَحَ بِالْكَفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ} (النحل: ۱۰۶) لیکن جو کفر کے بارے میں شرح صدر رکھتا ہو تو ان پر اللہ کا عذاب ہو اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تاویل کرنے

والے کافروں سے جدا ہیں کیونکہ انہیں کفر کے بارے میں نہ قطعی طور پر نہ ظنی طور پر شرح صدر حاصل ہے اور نہ ہی ان کے بارے میں کفر کا احتمال کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تجویز کیا جاسکتا ہے۔ (۶)

(۴) المناوی کہتے ہیں:

”صحیح بات یہی ہے کہ تاویل کرنے والے بدعتیوں کی تکفیر نہ کی جائے کیونکہ انہوں نے کفر کو اختیار کرنے کا قصد نہیں کیا بلکہ حق جاننے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ حق تک نہ پہنچ سکے۔ اس لیے ان کی حیثیت ایسے مجتہد جیسی ہے جو غلطی کا مرتکب ہو۔ محقق علماء کا یہی قول ہے۔ (۷)

(۵) شیخ عبدالرحمن السعدی کہتے ہیں:

”اہل قبلہ میں سے تاویل کرنے والے وہ لوگ جو کتاب و سنت کے فہم میں غلطی اور گمراہی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے تمام اقوال کو سچا سمجھتے ہیں، انہیں حق گردانتے ہیں۔ اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں لیکن بعض علمی اور عملی مسائل میں غلط راہ پر چل پڑتے ہیں۔ تو کتاب و سنت کے مطابق ایسے لوگ دین سے خارج نہ سمجھے جائیں گے۔ ان پر کافروں کے احکام جاری نہ ہوں گے۔ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد ائمہ سلف سب کے سب اس بات پر اجماع رکھتے ہیں۔ (۸)

(۶) شوکانی نے کتاب الأذہار (۹) کی ایک عبارت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ ”مرتد کسی بھی اعتبار سے ہو تو وہ کافر ہے“ تو وہ تاویل کرنے والوں کو بھی مرتد قرار دے رہے ہیں۔ تو یہاں ان کا قدم لڑکھڑا گیا ہے۔ ان کی یہ غلطی قابل معافی نہیں ہے کیونکہ اگر یہ بات درست ہو تو اس زمین پر رہنے والے اکثر مسلمان مرتد قرار دیے جائیں گے۔ وہ اس لیے کہ مذاہب اربعہ کے پیروکار یا تو اشعری ہیں یا ماتریدی اور وہ معتزلہ اور ان کے پیروکاروں کی تکفیر کرتے ہیں اور اس کے بالمقابل معتزلہ ان کی تکفیر کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ شیطان کے ہتھکنڈوں میں سے ایک ہتھکنڈا ہے۔ تعصب بلکہ ظلم کی انتہا ہے اور ہم نے اپنی تالیفات میں اس موضوع کو پوری طرح تفصیل سے بیان کیا ہے کہ جس کے بعد شکوک اور شبہات کا کوئی شوشہ باقی نہیں رہتا۔ (۱۰)

حواشی

(۱) الا بیان الاوسط، ص ۱۶۳۔

(۲) الفتاویٰ ۳۵: ۲۰۱۔

(۳) ایضاً ۷: ۲۱۷۔

(۴) ایضاً ۷: ۲۱۸۔

- (۵) سیر اعلام النبلاء، ۱۰: ۲۰۳
- (۶) ایثار الحق علی الخلق، ۲۲: ۲۶۸
- (۷) فیض القدیر، ۴: ۲۰۷۔
- (۸) الارشاد فی معرفة الاحکام، ص ۲۰۷۔
- (۹) کتاب الأثر ہار فی فقہ الائمۃ الاخیار، زیدی فرقہ کے بارے میں ہے اور اس کے مؤلف ہیں احمد بن یحییٰ المہدی، ف ۸۴۰ھ۔
- (۱۰) السیل الجرار، ۴: ۳۷۳ اور ۵: ۵۷۶۔ البتہ ان کا یہ کہنا کہ مذاہب اربعہ کے ماننے والے یا تو اشعری ہیں یا ماتریدی، تو شاید ان کی مراد غالب اکثریت سے ہو، کیونکہ ان کے ماننے والوں میں بہت سے اہل سنت والجماعت بھی ہیں جو سلفی منہج کے قائل ہیں۔

گناہ انسان کو دین سے خارج نہیں کرتا جب تک کہ اسے حلال نہ سمجھا جائے

دین کی خلاف ورزی دو طرح کی ہو سکتی ہے
ایک تو وہ کہ خلاف ورزی کرنے والا جان بوجھ کر ایسا نہ کر رہا ہو
دوسرے یہ کہ وہ ایسا جان بوجھ کر کر رہا ہو۔

اللہ کے دین کی تبلیغ کرنے والوں کا دونوں طرح کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ان دونوں قسم کے لوگوں سے کیسے برتاؤ کیا جائے۔ اس سے قبل ان لوگوں کے بارے میں بات ہو چکی ہے جو جان بوجھ کر خلاف ورزی نہیں کرتے۔ یہاں ہم ان لوگوں کا تذکرہ کریں گے جو ”گناہ“ کی شکل میں عہد آدین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔
قرآن و سنت کی نصوص کے مطابق بعض گناہوں پر کفر کا حکم لگایا گیا ہے۔ علماء اس بارے میں اختلاف رکھتے ہیں کہ اس سے مقصود کفر اعتقادی ہے یا کفر عملی؟

ان میں ہر طرح کے علماء ہیں۔ غالی بھی اور انتہائی متقابل بھی۔ اور ان دونوں کے مابین معتدل فکر رکھنے والے بھی۔ ان تمام علماء کے اقوال اور دلائل کو پیش کرنے کے لیے بڑا وقت درکار ہے جس سے قاری پر اگندہ ذہنی کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم صرف ان معتدل علماء کی آراء کا ذکر کریں گے جنہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ان نصوص سے مراد کفر عملی ہے نہ کہ اعتقادی! اور یہ کہ کسی واجب کا چھوڑ دینا اور حرام کام کا ارتکاب کرنا انسان کو دین سے خارج نہیں کرتا ہے چاہے یہ دونوں باتیں کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہوں۔ البتہ اگر ایسا آدمی ان احکامات کا سرے سے انکار کرتا ہو یا اس نے ایسا کام کیا ہو جو ارتداد کے زمرہ میں آتا ہو کہ جس پر سب کا اتفاق ہو تو اس کا معاملہ دوسرا ہے۔ یعنی کسی واجب کے چھوڑنے یا حرام کام کرنے سے انسان دین سے خارج نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ایسا کرنا اپنے لیے حلال نہیں سمجھتا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم گناہوں کو بہت ہلکا سمجھتے ہیں۔ ہم صرف بغیر کسی غلو یا کوتاہی کے ایک گناہگار کے بارے میں شرعی حکم بیان کر رہے ہیں اور اس یقین کے ساتھ کہ گناہگار کے لیے سزا کا وعدہ کیا گیا ہے الایہ کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادیں۔ اس ضمن میں ہم چند علماء کے قول نقل کریں گے:

(۱) امام ابو عبیدہ القاسم بن سلامؒ (ف ۲۲۴ھ) ارشاد فرماتے ہیں:

”مخالفت اور گناہ نہ ایمان زائل کرتے ہیں نہ کفر کو واجب قرار دیتے ہیں، لیکن وہ ایمان کی اس حقیقت اور اخلاص کی نفی کرتے ہیں کہ جس کا اللہ تعالیٰ نے ایک مؤمن کے اوصاف کی حیثیت سے بیان کیا ہے اور اپنی کتاب میں کئی جگہوں پر انہیں بحیثیت شرط قرار دیا ہے۔“ (۱)

(۲) امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (ف ۲۴۱ھ) ارشاد فرماتے ہیں:

”آدمی ایمان سے نکل کر اسلام تک محدود ہو جاتا ہے، اسلام سے اسے کوئی چیز نہیں نکال سکتی، یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے یا اللہ تعالیٰ کے فرائض میں سے کسی فرض کا منکر ہو کر چھوڑ دے، لیکن اگر وہ اسے سستی یا بے قدری کی بنا پر چھوڑتا ہے تو وہ اللہ کی مشیت کا پابند ہے، اللہ چاہیں تو اسے عذاب دیں، چاہیں تو معاف کر دیں۔“ (۲)

(۳) امام بخاری رحمہ اللہ (ف ۳۲۶ھ) ارشاد فرماتے ہیں:

باب: ”گناہ جاہلیت کے کام میں سے ہے“

”اور سوائے شرک کے ان کام مرتکب کا فر نہیں ہوتا جیسے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تم ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت پائی جاتی ہے۔“ اور جیسے اللہ عز و جل نے ارشاد فرمایا: {إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ} (النساء: ۴۸) ”بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہیں معاف کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، لیکن اس سے کم (گناہوں) کو جس کے لیے چاہے معاف کر سکتا ہے۔“ (۳)

(۴) امام محمد بن نصر المروزی (ف ۲۹۴ھ) ارشاد فرماتے ہیں:

اہل علم نے کہا: اور اس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ اللہ کو نہ ماننا کفر ہے اور اللہ کو ماننے کے باوجود فرائض کو ترک کرنا (یہ مانتے ہوئے کہ اللہ نے انہیں واجب قرار دیا ہے) کفر ہے لیکن اسے کفر باللہ (یعنی اللہ کا انکار کرنا) نہ کہا جائے گا بلکہ یہ کفر اس معنی میں ہے کہ حق کو چھوڑ دیا گیا جیسا کہ ایک شخص دوسرے سے بطور شکوہ کہتا ہے: تم نے میرے حق کا اور میری نعمتوں کا انکار کیا۔ مطلب یہ تھا کہ تم نے میرے حق کو بھی اور میری نعمتوں کو بھی ضائع کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا کہنے میں ہمیں اصحاب رسول اللہ اور تابعین کی پیروی کا شرف حاصل ہے کہ انہوں نے کفر کی فروع قرار دی ہیں کہ وہ فروع کے ارتکاب سے انسان ملت اسلام سے خارج نہیں ہوتا اور ایسے ہی انہوں نے اعمال کے اعتبار سے ایمان کی شاخیں ثابت کی ہیں کہ ان کے چھوڑنے سے انسان ملت اسلام سے خارج نہیں ہوتا اور اسی ضمن میں اس آیت کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

{وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ} (المائدہ: ۴۴)

”اور جو اس چیز کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کافر ہیں۔“ (۴)

(ابن عباس نے کہا: کفر دون کفر: یہ کفر کے مقابلے میں کمتر کفر ہے۔)

پھر انہوں نے کفر کے درجات کے بارے میں صحابہ اور تابعین کی روایات درج کی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ آیات کو چھوڑ کر فیصلہ کرنا کفر کا وہ درجہ ہے جو دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

(۵) امام احمد بن محمد سلامہ ابو جعفر الطحاوی (ف ۳۲۱ھ) کہتے ہیں:

”ہم اہل قبلہ میں سے کسی بھی شخص کو گناہ کے ارتکاب کی بنا پر کافر نہیں قرار دیتے جب تک کہ وہ اسے حلال سمجھ کر نہ کرتا ہو۔“ (۵)

(۶) امام ابوالحسن اشعری (ف ۳۲۴ھ) کہتے ہیں:

”ہمارا یہ دین ہے کہ ہم اہل قبلہ میں سے کسی شخص کو کسی گناہ کے ارتکاب کی بنا پر کافر قرار نہیں دیتے جیسے زنا، چوری یا شراب کا پینا، یہ تو خوارج کا مذہب ہے جو انہیں کافر سمجھتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص زنا، چوری اور ان جیسے دوسرے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، ان کا کرنا حلال سمجھتا ہے، ان کی حرمت کا قائل نہیں ہے تو وہ پھر کافر ہے۔“ (۶)

(۷) امام ابن بطہ العسبری (ف ۳۸۷ھ) کہتے ہیں:

”علماء کا اس بات پر اجماع ہے، بلکہ اس بات میں ان کا کوئی اختلاف نہیں کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو گناہ کی بنا پر کافر نہیں قرار دیا جائے گا اور نہ ہی کسی نافرمانی کی بنا پر اسے اسلام سے خارج کیا جائے گا احسان کرنے والے کے لیے ہم پر امید ہیں اور بدی کرنے والے کے انجام سے ڈرتے ہیں۔“ (۷)

(۸) امام بغوی (ف ۵۱۰ھ) ارشاد فرماتے ہیں:

”اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک مومن گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے ایمان سے خارج نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس کے جائز ہونے کا قائل نہ ہو۔ ایسے کسی عمل کے کرنے کے بعد اگر وہ بغیر توبہ کے مر جائے تو وہ آگ میں ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہے گا (جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا) بلکہ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، چاہے تو اسے معاف کر دے اور چاہے تو اس کے گناہ کے مطابق اسے سزا دے اور پھر اپنی رحمت سے اسے جنت میں داخل کر دے۔“ (۸)

(۹) علامہ ابن الجوزی (ف ۵۹۷ھ) سورۃ المائدہ کی آیت {وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ

اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ} کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”یہاں کفر سے مراد دو باتیں نقل کی گئی ہیں:

پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ کا انکار مراد ہے۔

دوسری یہ کہ حکمِ بَیِّنًا آنزَلَ اللہ کا انکار کرنا۔ یہ وہ کفر ہے جو ملت سے خارج نہیں کرتا۔

اور فیصلہ کن بات یہی ہے کہ جس نے بَیِّنًا آنزَلَ اللہ کے مطابق فیصلہ دینے سے اس اعتقاد

کے ساتھ انکار کیا کہ وہ اسے اللہ کا حکم نہیں مانتا یہ جانتے بوجھتے کہ اللہ ہی نے اسے نازل کیا ہے تو وہ یہودیوں کی مانند کافر ہے اور جو شخص انکار تو نہیں کرتا لیکن برائے خواہش اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو وہ ظالم اور فاسق ہے۔ علی بن ابی طلحہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے مَا أَنْزَلَ اللَّهُ کَانَکَار کیا تو وہ کافر ہے لیکن جو اس کا اقرار کرتا ہے لیکن فیصلہ اس کے مطابق نہیں کرتا تو وہ فاسق اور ظالم ہے۔” (۹)

(۱۰) امام ابن القیم (ف ۷۵ھ) تکفیر کی وضاحت میں مذکورہ دونوں اقوال کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

”فصل: دونوں فریق کے مابین فیصلہ اور دونوں گروہوں کے مابین فیصلہ کن خطاب۔ اس مسئلہ میں صحیح بات جاننے کے لیے ایمان اور کفر کی حقیقت جاننا ہوگی جس کے بعد ہی نفی یا اثبات کا حکم لگایا جاسکتا ہے ...

اور جہاں تک مَا أَنْزَلَ اللَّهُ کو چھوڑ کر فیصلہ دینا ہے یا نماز کا چھوڑنا ہے تو وہ کفر عملی میں قطعی طور پر آتا ہے۔ اور جب اللہ اور اس کے رسول نے اس پر کفر کا اطلاق کیا ہے تو اس سے کفر کی نفی نہیں کی جاسکتی ہے۔ تو مَا أَنْزَلَ اللَّهُ کے بغیر فیصلہ دینے والا کافر ہے اور نص رسول کے مطابق تارک الصلاۃ بھی کافر ہے لیکن یہ اعتقاد کا نہیں بلکہ عمل کے اعتبار سے کفر ہے۔” (۱۰)

(۱۱) امام ابن ابی العز الحنفی (ف ۷۹۲ھ) ارشاد فرماتے ہیں:

”تمام اہل سنت کا اس بات کا اتفاق ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ایک مسلمان کو ملت سے خارج نہیں کرتا ہے جیسا کہ خوارج کا عقیدہ ہے کیونکہ اگر وہ ملت سے خارج کرنے والے کفر کا مرتکب ہوتا تو برائے ارتداد قتل کا مستحق ہوتا اور ایسی صورت میں ولی (قصاص) کی طرف سے معافی بھی قبول نہیں کی جاتی اور نہ ہی زنا، سرقت اور شراب پینے میں حد جاری کی جاتی۔ یہ ایسا قول ہے کہ دین اسلام میں اس کا فاسد ہونا بدیہی طور پر معلوم ہے۔ اہل سنت کا اتفاق ہے کہ یہ اعمال اسے ایمان اور اسلام سے خارج نہیں کرتے نہ ہی وہ ان کی بنا پر کفر میں داخل ہوتا ہے اور نہ ہی کافروں کے ساتھ آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا مستحق قرار دیا جائے گا۔” (۱۱)

حواشی

- (۱) کتاب الایمان، شیخ البانی کی تحقیق کے ساتھ، ص ۴۰۔
- (۲) عقیدۃ احمد بن حنبل بروایت ابو بکر الخلال، ص ۱۶۱ اس کا ذکر مسدد بن مسدد بن مسدد بن مسدد کے ضمن میں ابن رجب کی ”طبقات الحنابلہ“ (۱: ۳۳۳) میں آیا ہے۔
- (۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب: المعاصی من أمر الجاہلیۃ۔
- (۴) تعظیم قدر الصلاۃ ۲: ۵۲۰۔
- ابن تیمیہ، المروزی کے بارے میں کہتے ہیں: محمد بن نصر المروزی: مشہور امام ہیں، اپنے زمانے میں

اجماع اور اختلاف کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں یا سب سے زیادہ علم رکھنے والوں میں ہیں” (الفتاویٰ ۴: ۲۱۶)

- (۵) العقیدۃ الطحاویہ: ابی ابن العزکی شرح کے ساتھ ص ۱۷۹۔
- (۶) الابانۃ من اصول الدیانۃ: امام ابو الحسن الأشعری باب: فی ابانۃ قول اهل الحق والسنة۔
- (۷) الشرح والابانۃ علی اصول السنة والدیانة “الابانۃ الصغری” (ص ۲۹۲)
- (۸) شرح السنة ۱: ۱۰۳۔
- (۹) زاد المسیر ۲: ۳۶۲۔
- (۱۰) الصلاة ص ۵۵-۵۷
- (۱۱) شرح العقیدۃ الطحاویۃ ص ۴۴۲ بتحقیق شعیب ارناؤوط۔

شہادت کلمہ طیبہ اور نماز 'خون' عزت اور مال کے لیے بچاؤ ہیں

ضابطہ نمبر ۱۱ میں ایک مسلمان کی عزت کی حرمت بیان ہو چکی ہے۔ یہاں ہم ایک دوسرا ضابطہ بیان کریں گے۔ اور وہ ہے، ”مسلمان کے خون اور مال کی حرمت“ ایسی بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں ایک مسلمان کے خون اور مال کے حرام ہونے کی تاکید کی گئی ہے۔ پھر ان میں تھوڑا سا تنوع واقع ہوا ہے، کچھ اس حرمت کو شہادت اسلام کے ساتھ مقید کرتی ہیں اور ایسی احادیث کی تعداد زیادہ ہے، اور کچھ نماز کا اور کچھ زکاة کا بھی اضافہ کرتی ہیں۔ لیکن جن روایات میں صرف شہادت کا ذکر ہے وہ بہت سارے مواقع پر نقل کی گئی ہیں جس کی بنا پر انہیں ترجیح حاصل ہے۔ نبی ﷺ نے پھر ان تین باتوں کا ذکر کیا ہے کہ جن کی بنا پر ایک مسلمان کا خون حلال ہو جاتا ہے یعنی قتل ناحق، شادی شدہ شخص کا زنا کرنا یا دین کو چھوڑنا اور جماعت سے علیحدگی اختیار کرنا۔ ان تین امور کے علاوہ کسی کے خون یا مال کے حلال ہونے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہاں ہم چند ایسی روایات بطور نمونہ عرض کرتے ہیں:

(۱) وہ روایات جن میں صرف شہادت کا ذکر ہے:

(۱) حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جب وہ مرتدین اور زکاة منع کرنے والوں سے جنگ کرنا چاہتے تھے: ”آپ ان سے کیسے قتال کریں گے جبکہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمادیا ہے: ”مجھے لوگوں کے قتال کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کریں“ اگر وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں تو وہ اپنے خون اور مال میرے ہاتھ سے محفوظ رکھ پائیں گے الا یہ کہ ان میں (کسی کا) کوئی حق ثابت ہوتا ہے۔“ (۱)

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں“ پھر اگر وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں تو وہ اپنے خون اور مال میرے ہاتھ سے محفوظ رکھ پائیں گے سوائے اس کے کہ ان میں (کسی کا) کوئی حق پایا جائے اور پھر ان کا محاسبہ اللہ کرے گا“ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: {فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَنْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ} (الغاشیہ) ”آپ تو یقیناً نصیحت کرنے والے ہیں“ ان پر نگران نہیں ہیں۔“ (۲)

ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔ (۲)

شیخ البانی نے ترمذی کی اس روایت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ صحیح اور متواتر ہے۔

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کی گواہی دیں، میرے اوپر اور جو کچھ میں لے کر آیا ہوں اس پر ایمان لائیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو مجھ سے اپنے خون اور مال کو محفوظ پائیں گے الا یہ کہ ان میں (کسی کا) کوئی حق پایا جائے اور پھر اللہ ان کا محاسبہ کرے گا۔“ (۴)

(۴) اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں الحرقہ کی طرف بھیجا۔ ہم صبح کے وقت ان پر حملہ آور ہوئے اور انہیں شکست دی، میں اور ایک انصاری ایک آدمی کا پیچھا کرتے ہوئے اس کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب ہم نے اسے پکڑ لیا تو اس نے کہا: لا الہ الا اللہ۔ تو انصاری نے تو اپنا ہاتھ روک لیا لیکن میں نے نیزے سے اس پر حملہ کیا اور اسے مار ڈالا۔ جب ہم واپس لوٹے اور نبی ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے کہا: ”اسامہ! کیا تم نے اسے“ لا الہ الا اللہ“ کہنے کے بعد بھی مار ڈالا؟“ میں نے کہا: ”وہ جان بچانے کے لیے ایسا کر رہا تھا!“ لیکن اللہ کے رسول بار بار یہی بات کہتے رہے یہاں تک کہ میں تمنا کرنے لگا کہ اے کاش میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔ (۵)

(۵) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ کہتے ہیں کہ محمود بن الربیع نے مجھ سے اور انہوں نے عتبہ بن مالک سے روایت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

”میں مدینہ آیا اور عتبہ بن مالک سے ملا اور کہا: وہ کیا حدیث ہے جو آپ کے بارے میں مجھ تک پہنچی ہے۔ انہوں نے کہا: میری بینائی کچھ جاتی رہی تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھجوایا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں اور وہاں نماز پڑھیں تو پھر میں اسے مصلیٰ قرار دے دوں۔ تو پھر نبی ﷺ چند صحابہ کے ساتھ تشریف لائے کہ جنہیں اللہ نے چاہا کہ وہ آپ کے گھر آئے، نماز پڑھی اور ان کے ساتھ پھر گفتگو کرنے لگے اور (جن لوگوں کے بارے میں بات کر رہے تھے) زیادہ تر ان کی نسبت مالک بن حشم کی طرف کی۔“ (۶) وہ کہنے لگے: ان کی خواہش ہے کہ وہ انہیں بد عادیں تو وہ ہلاک ہو جائے، اور ان کی خواہش ہے کہ اسے تکلیف پہنچے، نبی ﷺ نے جب نماز ختم کی تو کہا: ”کیا وہ اس بات کی گواہی نہیں دیتا کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں“ انہوں نے کہا: ہاں وہ یہ کہتا تو ہے لیکن دل سے نہیں کہتا، تو نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو کوئی بھی لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دے گا تو وہ آگ میں نہیں جائے گا یا آگ اسے مس نہیں کرے گی۔“ انس کہتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث اچھی لگی اور میں نے اپنے بیٹے سے کہا: اسے لکھ لو، تو اس نے اسے لکھ لیا۔“ (۷)

(۶) عبید اللہ بن عدی بن الخیار مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

”ایک دفعہ جب کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان تشریف فرما تھے تو ایک آدمی آیا اور ان سے سرگوشی کرنے لگا یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس نے کیا سرگوشی کی تھی یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی آواز بلند ہو گئی ’معلوم ہوا کہ وہ اللہ کے رسول سے ایک منافق آدمی کے قتل کی اجازت مانگ رہا تھا۔ نبی ﷺ نے جب آواز بلند کی تو یہ سنا کی دیا: “کیا وہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی نہیں دیتا؟” تو اس آدمی نے کہا: ہاں! لیکن اس کی گواہی کا اعتبار نہیں انہوں نے کہا: “کیا وہ نماز نہیں پڑھتا؟” اس نے جواب دیا: ہاں! لیکن اس کی نماز نماز نہیں تو اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: “یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے مجھے ان سے روکا ہے۔”

(۸)

(ب) وہ روایات جن میں شہادت اور نماز دونوں کا ذکر ہے:

(۱) حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ نے رسول کو یمن سے ایک کھال میں کچھ سونا بھیجا کہ جس سے ابھی اس کی مٹی بھی نہ جھڑی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے اسے ان چار آدمیوں میں تقسیم کر دیا۔ عیینہ بن حصن، الاقرع بن حابس، زید الخیل چوتھے یا تو علقمہ بن علائہ تھے یا عامر بن الطفیل تھے تو آپ کے صحابہؓ میں سے کسی نے کہا: ہم ان لوگوں کے مقابلے میں اس کے زیادہ حق دار ہیں۔ یہ بات نبی ﷺ تک پہنچی تو انہوں نے ارشاد فرمایا: “کیا تم مجھے امین نہیں سمجھتے حالانکہ میں اس کی طرف سے امین بنایا گیا ہوں جو آسمانوں میں ہے۔ وہ جو صبح اور شام آسمان کی خبریں بھیجتا ہے؟” راوی کہتا ہے کہ ایک آدمی کھڑا ہوا جس کی آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں۔ رخسار باہر نکلے ہوئے تھے۔ پیشانی ابھری ہوئی تھی۔ گھنٹی داڑھی تھی۔ سر منڈا ہوا تھا۔ تہبند اونچا تھا۔ اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ سے ڈر! تو آپ نے ارشاد فرمایا: “تیرا ستیاناس ہو! کیا میں زمین والوں میں سے سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا نہیں ہوں؟” پھر وہ آدمی پلٹ کر چلا گیا تو خالد بن الولید نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا میں اس کی گردن نہ مار دوں؟ تو آپ نے کہا: نہیں! ہو سکتا ہے یہ آدمی نماز پڑھتا ہو۔ تو خالد بن الولید نے کہا: کتنے ہی ایسے نمازی ہیں وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا۔ تو اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے اس بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ میں لوگوں کے دلوں کو ٹولوں یا ان کے پیٹ پھاڑ کر دیکھوں! پھر اس آدمی کی طرف دیکھ کر کہا کہ جو پیٹھ پھیر کر جا رہا تھا اس آدمی کی نسل سے ایسے لوگ نکلیں گے جن کی زبانیں اللہ کے کلام سے تر ہوں گی لیکن اللہ کا کلام ان کے حلق سے آگے نہیں جا سکے گا۔ یہ لوگ دین سے اس طرح خارج ہوں گے جیسے تیرا اپنے نشانے کو پھاڑتا ہوا نکل جاتا ہے۔ راوی کہتا ہے: اور شاید انہوں نے یہ بھی کہا: اگر میں ان لوگوں کو پالوں تو انہیں قوم شمود کی طرح فنا کر دوں۔ (۹)

(۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں۔ پھر اگر وہ (یہ کلمہ) کہہ ڈالیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں ہمارے قبلے کی طرف رخ کریں اور ہماری طرح جانور ذبح

کریں تو پھر ان کے خون اور مال ہمارے اوپر حرام ہیں الایہ کہ ان میں (کسی کا) حق ثابت ہو اور پھر اللہ ان کا محاسبہ کرے گا۔” (۱۰)

(ج) وہ روایات جن میں زکوٰۃ کے ذکر کا اضافہ ہے:

(۱) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں، یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اگر وہ ایسا کریں گے تو پھر وہ اپنے خون اور مال مجھ سے محفوظ سمجھیں سوائے اس کے کہ بطور اسلام ان میں کوئی حق ثابت ہو اور پھر ان کا حساب و کتاب اللہ کے ذمے ہو گا۔“ (۱۱)

اس حدیث میں نماز اور زکوٰۃ کا اضافہ علماء کے لیے اشکال کا باعث ہوا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اگر ابن عمر کے پاس یہ حدیث ہوتی تو وہ اپنے باپ کو اور حضرت ابو بکر سے زکوٰۃ روکنے والوں سے لڑائی کے ضمن میں جھگڑانہ کرتے اور اس وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ شاید راوی کو وہم ہوا ہے اور اللہ بہتر جانتے ہیں۔

ابن عبد البر اس حدیث کے بارے میں جس میں ذکر ہوا کہ ایک شخص نے اللہ کے رسول کے ساتھ منافق کو قتل کرنے کے بارے میں سرگوشی کی، کہتے ہیں: اس روایت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جس نے لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دے دی اور نماز بھی پڑھی تو اسے قتل کرنا جائز نہیں الایہ کہ وہ دین سے مرتد ہو جائے، یا شادی شدہ ہوتے ہوئے زنا کرے یا زمین میں فساد برپا کرے، راہزن ہو اور لوگوں سے ان کا مال ہتھیانے کے لیے لڑائی کرے یا اسی طرح کا کوئی عمل کرے، اور یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر نماز پڑھنے والے کا قتل جائز نہیں تو پھر نماز نہ پڑھنے والے کا قتل جائز ہوا۔ اور رسول اللہ ﷺ کا یہ کہنا کہ ”ان لوگوں کے قتل کرنے سے اللہ نے مجھے روکا ہے“ ان لوگوں کے قول کی تردید ہے جنہوں نے یہ کہا:

”ہاں! لیکن اس کی نماز، نماز نہیں! ہاں لیکن اس کی شہادت مقبول نہیں، کیونکہ اللہ کے رسول نے اس کی نماز اور اس کی شہادت دونوں کا اقرار کیا اور پھر یہ بتایا کہ جو آدمی ان دو باتوں کا حامل ہو تو اس کا قتل جائز نہیں، اور یہ کہ ایسا آدمی صرف ظاہری طور پر شہادت کا اقرار کرنے اور نماز پڑھنے کا مکلف ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اس کا حساب کتاب کریں گے، اگر وہ واقعی دل سے ایمان لایا ہے، اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے تو جنت میں داخل ہو گا۔ لیکن اگر وہ اپنے ایمان میں دھوکہ دہی کا مرتکب ہوا ہے تو وہ منافق ہے، آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہو گا، لیکن پھر بھی اسے قتل کرنا جائز ہے کیونکہ وہ بظاہر شہادت کا اقرار کر رہا ہے۔“ (۱۲)

ابن عبد البر اس شخص کے بارے میں جو نماز نہیں پڑھتا ہے، کہتے ہیں:

”اگر اسے قتل بھی کیا جائے تو اس کے وارثوں کو اس کے ترکہ سے محروم نہیں کیا جائے گا کیونکہ اگر وہ محمد ﷺ کی ان تعلیمات کا اقرار کرتا ہے جو توحید، شریعت اور دین اسلام سے متعلق ہیں، نماز روزے کی فرضیت کا بھی اقرار کرتا ہے لیکن انہیں ادا کرنے سے کتراتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ پر اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور موت کے بعد اٹھائے جانے پر بھی یقین رکھتا ہے تو اس کا قتل کفر کی بنا پر نہیں ہے۔“ (۱۳)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ ارشاد فرماتے ہیں:

”اللہ کے دین کی ضروریات میں سے ہے اور جس پر تمام امت کا بھی اتفاق ہے کہ اسلام کی بنیاد کے جس کا حکم تمام مخلوق کو دیا گیا ہے وہ شہادت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور اسی شہادت کی بنا پر ایک کافر مسلمان، ایک دشمن دوست بن جاتا ہے اور جس شخص کا خون اور مال مباح نہ ہو وہ اس کلمہ کی بنیاد پر اپنے خون اور مال کو محفوظ کر لیتا ہے۔“ (۱۴)

ابن الصلاح کہتے ہیں:

”دونوں شہادتوں کی ادائیگی کے بعد ایسے شخص پر بظاہر اسلام کا حکم لگایا جائے گا۔“ (۱۵)

ایسے بڑے بڑے واقعات ہوئے ہیں کہ کچھ لوگ جنہوں نے دونوں شہادتیں دیں مسلمانوں کے ساتھ نماز بھی پڑھی لیکن وہ منافقوں میں سے تھے تو نبی ﷺ نے ان کے خون یا مال کو حلال نہیں قرار دیا حالانکہ ان میں سے کئی لوگوں کی منافقت کے بارے میں اور ان کی بڑی بڑی جہالتوں کے بارے میں انہیں پورا علم تھا اور اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ شہادت کی ادائیگی کتنا عظیم کام ہے کہ جس کی بنا پر ایک شخص کا خون اور مال محفوظ ہو جاتا ہے الا یہ کہ وہ ان تین اعمال میں سے کسی ایک عمل کا مرتکب ہو کہ جس سے ایک شخص کا خون یا مال حلال ہو جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) منافقین نے نبی ﷺ کا مذاق اڑایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں قرآن کی وہ آیات نازل کیں جو انہیں کافر قرار دیتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نبی ﷺ نے انہیں واجب القتل قرار نہیں دیا اور اس کا سبب شاید ان کا شہادت کی ادائیگی تھا جیسا کہ عرض کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

{وَكَيْنَ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخْوَضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَيْدِي اللَّهِ وَأَيْتِهِ وَرَسُولُهُ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ ۚ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ إِنَّ نَعْفَ عَنْ طَافِيَةٍ مِّنْكُمْ نَعْدِبُ طَافِيَةً يَأْتِيهِمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ۝} (التوبة: ۶۵-۶۶)

”اور اگر آپ ان سے پوچھیں گے تو وہ کہیں گے: ہم تو صرف ہنسی مذاق کر رہے تھے کہہ دیجیے کہ اللہ اس کی آیات اور اس کا رسول ہی تمہارے ہنسی مذاق کے لیے رہ گئے ہیں؟ تم بہانے نہ

بناؤ یقیناً تم نے اپنے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے، اگر ہم تم میں سے کچھ لوگوں کو معاف بھی کر دیں تو کچھ لوگوں کو ان کے جرم کی پاداش میں سخت عذاب بھی دیں گے۔”

(۲) سردار منافقین عبد اللہ بن ابی کا وہ قول جو اللہ عز و جل نے قرآن میں نقل

کیا:

{ يَقُولُونَ لِمَنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ } (المنافقون: ۸)

”یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ پلٹ کر آئے تو زیادہ عزت والا زیادہ ذلت والے کو نکال باہر کرے گا حالانکہ عزت تو صرف اللہ کے رسول اور مؤمنوں کے لیے ہے لیکن منافقین اس بات کو نہیں جانتے۔“

یہ کتنے بڑے کفر کی بات تھی جو اس نے کہی اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایک آدمی جب تک دین سے خارج ہونے کا اعلان نہ کرے تو اس کا خون حلال نہیں ہے، اسے سزا دی جاسکتی ہے۔ جیل میں بند کیا جاسکتا ہے لیکن ان قطعی نصوص کی روشنی میں اسے قتل نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) جیسا کہ پہلے یہ اس شخص کے بارے میں ذکر ہو چکا ہے جس نے نبی ﷺ سے کہا

تھا:

”اَتَيْتُ اللَّهَ (اللہ سے ڈر) بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! انصاف کرو، تو انہوں نے ارشاد فرمایا: تم برباد ہو، اگر میں انصاف نہ کروں تو کون انصاف کرے گا؟ تم ناکام ہو اور برباد ہو اگر میں انصاف نہ کروں۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا: مجھے اجازت دیں تو میں اس کی گردن مار دوں تو ارشاد فرمایا: رہنے دو! اس کے ایسے ساتھی ہوں گے کہ ایک شخص ان کی نمازوں کے مقابلے میں اپنی نماز کو اور ان کے روزوں کے مقابلے میں اپنے روزے کو حقیر سمجھے گا۔ یہ لوگ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق سے آگے نہیں اترے گا، دین میں سے ایسے نکلیں گے جیسے تیر اپنے نشانے کو پھاڑتے ہوئے نکلتا ہے، وہ اس کے پھل کی طرف دیکھے گا تو وہاں کچھ نہ ہوگا، سرے کو دیکھے گا وہاں کچھ نہ ہوگا، اس کے پچھلے حصے کو دیکھے گا وہاں کچھ نہ ہوگا، اس کے پروں کو دیکھے گا تو وہاں کچھ نہ ہوگا، گویا خون اور غلاظت سے بچتا بچتا نکل گیا ہے۔“ (۱۶)

کیا یہ کھلم کھلا ارتداد نہیں ہے؟ لیکن اس شخص نے دین چھوڑنے کا اعلان نہیں کیا بلکہ ایسی بات کہی کہ جس سے وہ اپنے تئیں دین کی نصرت کر رہا تھا، وہ اپنے زعم کے مطابق اس شخص سے انصاف کرنے کا مطالبہ کر رہا تھا کہ جسے انصاف قائم کرنے کے لیے ہی بھیجا گیا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ جو کچھ اس نے کہا وہ گمراہی تھی لیکن چونکہ وہ مسلمان ہو چکا تھا اس لیے اس نے اپنے خون کو محفوظ کر لیا تھا۔

یہاں اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ جس نے دونوں شہادتیں ادا کر دیں اور دین سے خروج کا اعلان نہیں کیا نہ ہی کسی ایسے شخص کو قتل کیا جس کا قتل کرنا حرام تھا نہ ہی شادی شدہ ہوتے ہوئے زنا کا ارتکاب کیا تو وہ معصوم الدم ہے (یعنی اس کا خون نہیں بہایا جاسکتا)۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عذاب کے مستحق نہیں ہوں گے کیونکہ منافقین کے خون بھی حلال نہیں لیکن وہ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔

اس تفصیل کے بعد کیا ایک مسلمان کے لیے دوسرے گنہگار مسلمان یا مبنی بر خطاء تاویل کرنے والے کا خون بہانا جائز ہوگا؟

حواشی

- (۱) صحیح البخاری، حدیث نمبر ۲۸
- (۲) صحیح مسلم، حدیث نمبر ۱۳۷
- (۳) سنن الترمذی، حدیث نمبر ۳۳۴۱۔
- (۴) صحیح مسلم، حدیث نمبر ۴۱۳
- (۵) صحیح البخاری، حدیث نمبر ۴۲۶۹۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر ۲۸۸۔
- (۶) امام نووی کہتے ہیں: حدیث کے یہ الفاظ "اسند و اعظم ذالک و کبرہ" کا مطلب ہے کہ انہوں نے منافقین کے بارے میں بات کی ان کے قبیح افعال کا ذکر کیا اور ان کے کرتوتوں کا اور ان کی اکثر باتوں کا منبع مالک بن وحشم کو قرار دیا۔ (شرح مسلم: ۲۴۳)
- (۷) صحیح مسلم، حدیث نمبر ۱۵۸۔
- (۸) مؤطا امام مالک، حدیث نمبر ۴۱۳۔
- (۹) صحیح البخاری، حدیث نمبر ۴۳۵۱، صحیح مسلم، حدیث نمبر ۲۵۰۰۔
- (۱۰) ایضاً حدیث نمبر ۳۹۱۔
- (۱۱) ایضاً حدیث نمبر ۲۵۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر ۱۳۸۔
- (۱۲) الاستذکار، ۲: ۲۸۴۔
- (۱۳) ایضاً ۲: ۱۱۶۔
- (۱۴) یہ بات شیخ سلیمان بن عبد اللہ نے اپنی کتاب تیسیر العزیز الحمید (۱: ۱۴۸) میں نقل کی ہے مجھے ابن تیمیہ کی تحریرات میں اس تک رسائی نہیں ہوئی۔
- (۱۵) صیانة مسلم، ۱: ۱۳۴۔
- (۱۶) صحیح مسلم، حدیث نمبر ۲۵۰۵۔

دین کی نصرت کے لیے مخالفین کے ساتھ تعاون واجب ہے

دعوت و تبلیغ کے میدان میں کام کرنے والے اکثر حضرات اس بات میں غلطی کر جاتے ہیں کہ اگر چند مسائل میں ان سے مخالفت کرنے والے لوگ انہیں کسی دینی امر میں نصرت کے لیے بلائیں تو ان کا موقف کیا ہونا چاہیے۔ وہ صرف اس اندیشے سے کہ ان کی جماعت کے موتی بکھر نہ جائیں یا ان کی اپنی جماعت کا اتحاد باقی نہ رہے وہ ایسی کسی دعوت پر لبیک نہیں کہتے اور اس طرح وہ پارٹی کی جزوی مصلحت کو دین کی مصلحت پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہ جان بوجھ کر یا بر بنائے جہالت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دین ان کی جماعت کا نام ہے اور امت ان کی پارٹی ہی ہے اگر ایسا ہے تو یہ بات درست نہیں ہے اور ایسا اعتقاد رکھنے والا اپنے اس غلط خیال کی بنا پر ایک حق بات کی حمایت سے دستکش ہونے کا مرتکب ہو گا جس کا سبب صرف یہی غلط نظریہ ہے جو اپنی جماعت کو سب کچھ سمجھنے کی بنا پر قائم ہوا ہے۔

دیکھئے کہ ہمارے نبی ﷺ نے جنگ پر آمادہ ان کافروں کے ساتھ صلح حدیبیہ کا معاہدہ کیا جو آپ کے مستند دشمن تھے لیکن آنحضور ﷺ کے پیش نظر دین کی مصلحت تھی۔ انہوں نے اس وقت یہ نہیں کہا کہ میں اپنے ساتھیوں کے فتنے میں پڑ جانے سے ڈرتا ہوں تو پھر مسلمان مبلغین کے لیے کیسے جائز ہے کہ وہ اپنے ان مسلمان بھائیوں سے تعاون نہ کریں جو بر بنائے اجتہاد چند مسائل میں ان سے اختلاف رکھتے ہیں اور وہ بھی صرف اس اندیشے کی بنا پر کہ ان کی جماعت کو نقصان پہنچے گا۔ جو جماعت دین کے صحیح مفہوم پر قائم ہے وہی اللہ عز و جل کے زیادہ قریب ہے اور اس کے لیے کامیابی مقدر ہے اور وہ اس لیے کہ جماعتوں کا قیام دین کی نصرت کے لیے ہوتا ہے نہ اس لیے کہ انہیں بذات خود دین سمجھا جائے اس لیے اگر واقعی دین کی نصرت مطلوب ہے تو جو نہی مخالفین کی طرف سے دین کی نصرت کی دعوت دی جائے تو نبی ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی اتباع میں ایسی دعوت پر لبیک کہنا چاہیے جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ نبی ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر مشرکین مکہ کی خواہش کا احترام کیا۔ اس واقعے کے بارے میں احادیث اور سیرت کی کتابوں میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

ہم صحیح بخاری سے اس واقعے کے چند پہلو امام ابن القیم کے ارشادات کے ساتھ یہاں پیش کرتے ہیں:

امام بخاری نے حدیبیہ کے قصے میں نبی ﷺ کی اونٹنی قصواء کا ذکر کیا ہے کہ وہ کیسے حدود حرم کے نزدیک بیٹھ گئی تو صحابہ نے کہا: قصواء تو بیٹھ گئی، قصواء تو بیٹھ گئی، تو نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: قصواء نہیں بیٹھی اور ایسا کرنا اس کی طبیعت میں داخل نہیں لیکن ہاتھی والے واقعے کی طرح اسے بھی رکنا پڑا ہے، پھر ارشاد فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ لوگ اگر ایسی کوئی بھی بات مانگیں گے جس میں اللہ کے نزدیک مقدس چیزوں کی تعظیم مقصود ہوگی تو وہ میں انہیں بخش دوں گا“ پھر آپ نے اونٹنی کو ہنکارا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔“ (۱)

ابن القیم اس قصے پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:
 ”حدیبیہ کے قصے میں چند فقہی فوائد کا تذکرہ“
 اور پھر چند فوائد ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”اور ان فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر مشرکین، بدعتی، مجرمن، ظالم اور باغی یوں بھی کسی ایسے کام میں مدد کے خواستگار ہوں جس میں اللہ کے نزدیک کسی مقدس چیز کی عظمت مطلوب ہو تو اس پر لبیک کہا جائے گا، جو وہ مانگیں گے دیا جائے گا اور ان کی مدد کی جائے گی، یعنی یہ مدد ان کے کفر اور بغاوت کے لیے نہ ہوگی بلکہ صرف ان کاموں کے لیے ہوگی جن میں اللہ کے ہاں مقدس اشیاء کی تعظیم پائی جائے گی۔ باقی کسی دوسری چیز میں ان کی مدد نہ کی جائے گی، تو جو شخص بھی ایسے کام پر مدد مانگے جو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہو اور اللہ اس سے راضی ہو تو اس کی مدد کی جائے گی اور یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ مدد کا طلب گار کون ہے۔ البتہ ایک شرط یہ ہے کہ اس پسندیدہ چیز پر مدد کرنے کے نتیجے میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو اللہ کو انتہائی نا پسندیدہ ہو، یہ سارا معاملہ انتہائی پیچیدہ، مشکل اور نازک امور میں سے ہے جو نفس پر بہت شاق گزرتے ہیں اور اسی لیے صحابہ میں سے بھی کچھ لوگوں پر یہ شاق گزرے۔“ (۱)

نبی ﷺ نے اپنے اس رویے سے اللہ کے اس حکم کی تعمیل کی جس میں نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون پر ابھارا گیا ہے۔

اور اگر ایک کافر کے ساتھ بھی نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں (جیسے کہ مقدس اشیاء کی تعظیم کرنا) تعاون جائز ہے تو پھر مسلمان مخالفین کے ساتھ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرنا بالاولیٰ جائز ہوگا اور وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان کو ”چاہے وہ پابند سنت ہو یا بدعتی ہو“ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرنے کا حکم دیا ہے اور اسے صرف نیکوکاروں تک محدود نہیں رکھا ہے، ارشاد فرمایا:

{وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝} (المائدہ: ۲)

”اور نیکی اور تقویٰ (کے کاموں) پر تعاون کرو، اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو“

اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔“
ابن عاشور اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”یعنی یہ تمہارے واجبات میں سے ہے کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو اور اگر یہ ان پر واجب ہے تو انہیں نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ہر صورت تعاون کرنا چاہیے اور اس طرح تعاون کرنے میں مطلوبہ شے کے حصول کی محبت بھی پیدا ہوتی ہے۔ گویا انسان پھر رغبت کے ساتھ یہ کام کرتا ہے تو پھر ضروری ہوا کہ چاہے دشمن ہی کیوں نہ اس تعاون کا خواہش مند ہو اس کے لیے دست تعاون دراز کیا جائے حج کرنا بھی نیکی ہے توجہ میں بھی اور تقویٰ کے کام میں بھی اس کی مدد کرو وہ لوگ چاہے کافر کیوں نہ ہوں ان کے ساتھ نیکی کے ہر کام میں تعاون کیا جائے نیکی خود تقویٰ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور یوں اس فعل کو بار بار کرنے سے انہیں اسلام کے قریب آنے میں مدد مل سکتی ہے۔“

پھر وہ ارشاد فرماتے ہیں:

”تَعَاوَنُوا“ کی ضمیر اور مفاعلہ کے وزن (یعنی معاونت) کا تقاضا ہے کہ مسلمان ایک دوسرے سے نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کریں تعاون کے نتیجے میں عمل میں آسانی پیدا ہوتی ہے مفادات حاصل ہوتے ہیں اتحاد اور باہمی مدد کا اظہار ہوتا ہے اور پھر یہ عمل امت کا خاصہ بن جاتا ہے۔“ (۳)

بلکہ اس سے بڑھ کر ملاحظہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کو جن کا نفاق اللہ سے ڈھکا چھپا نہیں ہے اور جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار بھی رہتے ہیں امت کے مفاد اور حق کے غلبہ کے لیے انہیں بھی مسلمانوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے کی دعوت دی ہے تو پھر ان میں مسلمان منافقین کے ساتھ تعاون کیوں نہ جائز ہو گا تاکہ دین کی نصرت ہو سکے اور حق کا بول بالا ہو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

{وَلْيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ ادْفَعُوا قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَا اتَّبَعْنَاكُمْ هُمْ لِلْكَفَرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ} (آل

عمران: ۱۶۷)

”اور تاکہ منافقوں کو بھی جان لے جن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جہاد کرو یا کافروں کو ہٹاؤ تو وہ کہنے لگے کہ اگر ہم لڑائی جانتے ہوتے تو ضرور ساتھ دیتے اس دن بہ نسبت ایمان کے کفر سے بہت قریب تھے۔ اپنے منہ سے وہ باتیں بناتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔“

ابو جعفر طبری کہتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کی مراد ہے ’ منافق عبد اللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھی جو کہ اس وقت اللہ کے رسول کا ساتھ چھوڑ گئے تھے جب وہ مشرکین سے قتال کے لیے جبل احد کی طرف روانہ ہو رہے تھے ’ مسلمانوں نے ان سے کہا تھا: آؤ ہمارے ساتھ مل کر مشرکین سے قتال کرو یا ہمارے ساتھ رہو کہ ہماری جمیعت زیادہ ہوگی تو وہ بھاگ کھڑے ہوں گے ’ تو انہوں نے جواباً کہا: اگر ہم یہ جانتے کہ تم واقعی لڑو گے تو ہم تمہارے ساتھ ضرور چلتے ’ ہم ویسے ان کے مقابلے میں تمہارے ساتھ ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ تمہاری اور ان کی جنگ نہ ہوگی ’ اور یوں انہوں نے اس منافقت کو جسے وہ چھپائے ہوئے تھے ظاہر کر دیا۔ زبان سے صاف صاف کہہ دیا: {لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَا تَبْعُنَاكُمْ} (اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ لڑائی ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ آتے) اور اس قول کی آڑ میں اس عداوت کو پھر بھی چھپائے رکھا جو وہ رسول

اللہ ﷺ اور اہل ایمان سے رکھتے تھے۔“ (۳)

اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ منافقین ’ مشرکین کے ساتھ لڑائی میں نبی ﷺ اور صحابہ کے ساتھ تھے ’ اور اس اندیشے کی بنا پر کہ کہیں ان سے مدد لینے کی وجہ سے منافقین کی مدینہ میں حیثیت مضبوط نہ ہو جائے ’ ان سے تعاون لینے کو نظر انداز نہیں کیا گیا کیونکہ نگاہ اصل مقصد کی طرف تھی ’ یعنی مشرکین کا زور توڑنا۔ نبی ﷺ کے یہ مختلف واقعات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کا مفاد ’ جماعتی یا گروہی مفاد پر مقدم ہے تو پھر اپنے مسلمان بھائی سے کہ جس سے ہم بعض شرعی نصوص کے فہم میں اختلاف رکھتے ہیں ’ دین کی نصرت کی خاطر تعاون کرنا کیونکر جائز نہ ہوگا۔

حواشی

(۱) البخاری ’ حدیث نمبر ۲۷۳۱۔

(۲) اعلام الموقعین ’ ۳: ۲۹۵۔

(۳) التحریر والتنویر ۲: ۱۰۶-۱۰۷۔

(۴) طبری ’ سورۃ آل عمران ’ آیت ۱۶۷۔

جماعت مسلمین کی شیرازہ بندی کا خیال رکھنا

دین بغیر جماعت کے فتح و نصرت کے جھنڈے نہیں گاڑ سکتا۔ جماعت اتحاد کے بغیر ممکن نہیں۔ اتحاد اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب جماعت کا ہر فرد سمجھ رکھتا ہو اور یہ سمجھ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک تربیت نہ کی جائے۔ ایسی تربیت جو امت کی صفوں میں اتحاد کی ضرورت اور اہمیت کو جماعت کے ہر فرد میں جاگزیں کر دے۔

جماعت کو اکٹھا رکھنے اور اس کی صفوں میں اتحاد قائم رکھنے کے بارے میں قرآن و حدیث کے بہت سے دلائل ہیں۔ جماعت کو برقرار رکھنا ایک فرض ہے اور کسی مستحب امر کے چھوٹ جانے یا کسی انفرادی فرض کے رہ جانے کے عذر سے جماعت کی صفوں میں انتشار پیدا کرنا جائز نہیں اور وہ اس لیے کہ مسلمانوں کا متحد رہنا فرض ہے اور ان فرقوں میں بٹنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{وَاَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا} (آل عمران: ۳)

”اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقوں میں نہ بٹو۔“

اور ارشاد فرمایا:

{إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتُ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ}

(الانعام: ۱۵۹)

”جن لوگوں نے دین میں تفریق ڈالی اور فرقوں میں بٹ گئے، آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں

ہے۔“

اور نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جو شخص جماعت کو چھوڑتا ہے اور اطاعت چھوڑتا ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔“ (۱)

یہ آیات اور حدیث اتحاد کے واجب ہونے اور فرقہ بازی کو حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ طحاوی کہتے ہیں:

”ہم سنت اور جماعت کی پیروی کرتے ہیں اور شذوذ، مخالفت اور فرقہ بازی سے پرہیز کرتے

ہیں۔“ (۲)

شیخ الاسلام ارشاد فرماتے ہیں:

”ایک مسلمان پر فرض ہے کہ وہ جہاں کہیں کسی مسلمانوں کے شہر میں جائے تو ان کے ساتھ جمعہ اور جماعت میں شریک ہو، مسلمانوں سے دوستی رکھے نہ کہ دشمنی، اگر کسی کو راہ راست پر نہ پائے یا بھٹکا ہوا دیکھے اور پھر اس کو راہ ہدایت پر لانا ممکن ہو تو اس کی کوشش کرے ورنہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے کہ اللہ کسی نفس پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔“ (۳)

امام ابن تیمیہ بسم اللہ کے پڑھنے میں اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں کی صفوں میں اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”ایک شخص کے لیے یہ بات بہتر ہے کہ وہ مستحب امور کو صرف لوگوں کے دلوں کو جوڑنے کے لیے چھوڑ دے کیونکہ ایسے امور پر اصرار کرنے کے بجائے لوگوں کے دلوں کو جوڑنا زیادہ وزن رکھتا ہے۔ نبی ﷺ نے صرف تالیف قلوب کی خاطر بیت اللہ کی از سر نو تعمیر کو چھوڑنا گوارا کر لیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پہلے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا کہ وہ مٹی میں حالت سفر کی بنا پر نماز پوری کیوں پڑھتے ہیں؟ لیکن پھر ان کے پیچھے پوری نماز بھی پڑھی اور یہ کہا کہ اختلاف ایک برائی ہے۔“ (۴)

پھر وہ کہتے ہیں:

”امام اگر کسی چیز کو مستحب سمجھے جبکہ مقتدی اسے مستحب نہ سمجھتے ہوں تو صرف اتحاد اور تالیف قلوب کی خاطر اس کا چھوڑنا بہتر ہوگا۔“ (۵)

پھر وہ اس کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جیسے جمعے سے قبل دو رکعت کا ادا کرنا کہ سنت میں ایسا وارد نہیں ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

”اگر ایک شخص ایسی جماعت میں ہو جو اسے پڑھتے ہوں، پھر اگر لوگ اس کی بات سنتے ہوں اور مانتے ہوں تو وہ انہیں سنت سے آگاہ کرے اور یہ دور کعتیں نہ پڑھے، لیکن اگر اس کی بات نہ مانتے ہوں اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ ان دو رکعتوں کی ادائیگی سے لوگوں کے دلوں میں الفت قائم ہو سکتی ہے یا بھی ان کے دل اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس مسئلہ پر جھگڑا کرنا شروع کر دیں تو پھر بہتر ہے کہ وہ اس مسئلہ کو نہ چھیڑے۔“ (۶)

امام - رحمہ اللہ - فروعی اختلافات کے بارے میں ایک امتیازی اصول عرض کرتے ہیں کہ جس کی رو سے فروعی مسائل کی بنا پر اصولی باتوں کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں:

”جماعت سے جڑے رہنا اور باہمی الفت اور محبت قائم رکھنا دین کی بنیادی باتوں میں سے ہے اور ایک فروعی مسئلہ کو جس میں اختلاف کیا جا رہا ہے، بہر صورت چند پوشیدہ فروعی مسائل میں سے ہے، تو پھر ایک شاخ کی حفاظت کے بہانے جڑ کو کیسے برباد کیا جاسکتا ہے۔“ (۷)

امام ملہم کی یہ بات کیا ہی خوبصورت بات ہے:

”دلوں کو جوڑنا اس مستحب فعل کے کرنے سے زیادہ بڑا ہے کہ جو دلوں میں نفرت پیدا کرے، ایک مستحب امر کا چھوڑنا اتفاق اور تالیف قلوب کے لیے زیادہ مستحسن ہے اور ایسے ہی صرف

جھگڑے یا شر سے بچنے کے لیے مستحب کو چھوڑنا ایک اچھی بات ہے، جماعت کو تھام کر رکھنا اور محبت و الفت کو باقی رکھنا دین کے بنیادی اصولوں میں سے ہے جسے ایک فرعی مسئلے کی بنا پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔

یہ اصول ایک زریں اصول ہے جو ہر طالب علم بلکہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور اسی اصول کی بنیاد پر جماعت مسلمین کو باقی رکھا جاسکتا ہے اور ان کے مابین اختلاف کے دروازے کو بند کیا جاسکتا ہے۔

حواشی

- | | |
|--------------------------------|-------------------------|
| (۱) صحیح مسلم، حدیث نمبر ۱۸۴۸۔ | (۲) شرح الطحاویہ، ص ۶۴۴ |
| (۳) الفتاویٰ ۲۸۶:۳۔ | (۴) ایضاً ۲۲:۲۰۷۔ |
| (۵) ایضاً ۲۲:۲۶۸۔ | (۶) ایضاً ۲۴:۱۹۴-۱۹۵۔ |
| (۷) ایضاً ۲۲:۲۵۴۔ | |

حرفِ آخر

یہ وہ انتہائی ضروری ضابطے ہیں جنہیں میں نے کتاب و سنت کی نصوص سے اخذ کر کے ایک لٹری میں پرو دیا ہے اور انہیں علماء افاضل کی آراء سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہر مسلمان کو اپنے ان بھائیوں کے ساتھ جن سے دین کے کسی مسئلے میں اختلاف ہوا ہے پورا پورا خیال کرنا چاہیے ' ہم ایسے زمانے میں ہیں کہ اُمت کا شیرازہ بکھر چکا ہے ' دشمن اپنے مکرو فریب میں آگے آگے ہے ' اور پھر اگر ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کیا اور دشمنوں کی چالوں کے مقابلے میں اپنی صفوں کی شیرازہ بندی نہ کی تو ہم نہ صرف دنیا بلکہ دین بھی کھو بیٹھیں گے۔

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ماضی میں ہماری ثقافت اصولوں پر قائم نہیں رہی ہے بلکہ اس وقت کے حالات کے تناظر میں تھی ' اور بحث و تحقیق پر انحصار نہ رکھتی تھی اور نہ ہی نتائج کا لحاظ رکھتی تھی جس کے نتیجے میں ہمیشہ جلد بازی سے کام لیا گیا احکام کے صادر کرنے میں بھی اور کوئی ایک موقف اپنانے میں بھی ' اور پھر جس کی بنا پر امت کی صفوں میں رخنے پڑتے گئے۔

ہم اس لیے تم طالبانِ علم اور داعیانِ اُمت کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت اپنے طریق کار پر نظر ثانی کریں ' یاد رہے کہ انسان کی عزت بھی ویسے ہی محترم ہے جیسے خون اور مال ' اور لوگوں کی عزتوں کے بارے میں چھینٹے اڑانا یا اس میں سستی سے کام لینا نہ صرف یہ کہ اُمت میں تفریق ڈالنے کا سب سے بڑا وسیلہ ہے ' خود ایک بہت بڑا گناہ ہے ' امت کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا نہ صرف بڑے فرائض میں سے ہے بلکہ دین کے اصولی مسائل میں سے ہے جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس کا بیان پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ امت کی کھوئی ہوئی عزت اور بزرگی کو بحال کریں اور جو مصائب آن پڑے ہیں انہیں دور فرمادیں ' بے شک وہ دعائیں سنتے اور قبول کرتے ہیں۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد و علی آلہ و صحبہ و سلم

فہرست کتاب

تعارف از ڈاکٹر سعد بن علی الشہرانی

مقدمہ اشاعت اول از ڈاکٹر احمد بن سعد حمدان الغامدی

مقدمہ اشاعت دوم

تمہید

- ضابطہ نمبر ۱ : نیت کا درست کرنا واجب ہے
 ضابطہ نمبر ۲ : اپنے نفس کو پاک کہلانے سے بچنا
 ضابطہ نمبر ۳ : حق کو قبول کرنے پر نفس کو آمادہ کیے رکھنا
 ضابطہ نمبر ۴ : اختلاف کو ایسے سمجھنا کہ وہ لوگوں کے درمیان ایک طبعی امر ہے
 ضابطہ نمبر ۵ : لوگوں کی ذہنی صلاحیتوں کا خیال رکھنا
 ضابطہ نمبر ۶ : حالات اور معاشرے کا خیال رکھنا
 ضابطہ نمبر ۷ : اجتہاد پر مبنی مسائل کا انکار نہیں کیا جاسکتا، لایہ کہ وہ نص صریح کے مخالف ہوں۔

- ضابطہ نمبر ۸ : علانیہ مناظرے سے سوائے اشد ضرورت کے اجتناب کرنا
 ضابطہ نمبر ۹ : تردید اور تنقید میں حد سے تجاوز نہ کرنا
 ضابطہ نمبر ۱۰ : مسلمانوں کی عزت و وقار کا خیال رکھنا
 ضابطہ نمبر ۱۱ : ظاہری افکار کی روشنی میں معاملہ کرنا
 ضابطہ نمبر ۱۲ : مخالف کے ساتھ انصاف کرنا واجب ہے
 ضابطہ نمبر ۱۳ : عدل کا دامن تھامے رہنا
 ضابطہ نمبر ۱۴ : مخالف کا احترام کرنا اور اس میں کیڑے نہ نکالنا۔
 ضابطہ نمبر ۱۵ : کسی کے بارے میں حکم نہ لگانا مگر مکمل استقراء کے بعد
 ضابطہ نمبر ۱۶ : واسطہ قول سے ہونا چاہیے نہ کہ قائل سے
 ضابطہ نمبر ۱۷ : انسان کے ذاتی فہم کو شرع کے درجے میں نہ سمجھنا
 ضابطہ نمبر ۱۸ : دینی مسائل کو بشری طبیعت کا لبادہ نہ اوڑھنا
 ضابطہ نمبر ۱۹ : علماء کے اقوال پر تعصب نہ رکھنا
 ضابطہ نمبر ۲۰ : قول اور فعل کے نتائج کا لحاظ رکھنا

- اس بات کا اعتقاد رکھنا کہ غلط اجتہاد پر مجتہد کی غلطی معاف کی جاتی ہے : ضابطہ نمبر ۲۱ :
 اجتہاد میں غلطی دوستی کو ختم کرنے یا کمزور کرنے کا باعث نہیں ہوتی : ضابطہ نمبر ۲۲ :
 تاویل کی غلطی ایک مسلمان کو دین سے خارج نہیں کرتی : ضابطہ نمبر ۲۳ :
 گناہ انسان کو دین سے خارج نہیں کرتا جب تک کہ اسے حلال نہ سمجھا جائے : ضابطہ نمبر ۲۴ :
 شہادت کلمہ طیبہ اور نماز 'خون' عزت اور مال کے لیے بچاؤ ہیں : ضابطہ نمبر ۲۵ :
 دین کی نصرت کے لیے مخالفین کے ساتھ تعاون واجب ہے : ضابطہ نمبر ۲۶ :
 جماعت مسکین کی شیرازہ بندی کا خیال رکھنا : ضابطہ نمبر ۲۷ :
 حرف آخر

فهرست مأخذ ومصادر

- ١- محمد بن محمد الغزالي ابو حامد: احياء علوم الدين 'دار المعرفة' بيروت
- ٢- محمد بن علي الشوكاني: أدب الطلب ومنتهى الأرب 'دار ابن حزم' لبنان 'بيروت ١٢١٩ هـ (١٩٩٨ ع)' طبعه اولي تحقيق عبدالله يحيى السريحي
- ٣- محمد بن اسماعيل الصنعاني: ارشاد النقاد الى تيسير الاجتهاد- الدار السلفية الكويت ١٢٠٥ هـ- طبعه اولي 'تحقيق صلاح الدين مقبول احمد
- ٤- أحمد بن عبد الحلیم ابن تیمیة الحرانی ابو العباس: الاستقامة 'جامعه الامام محمد بن سعود' المدينة المنورة 'طبعه اولي ١٢٠٣ هـ' تحقيق د/ محمد رشاد سالم
- ٥- محمد الأمين بن محمد بن المختار الحكيны الشنقيطي: اضواء البيان في ايضاح القرآن بالقرآن
- ٦- امام شاطبي: الاعتصام
- ٧- محمد بن ابي بكر ايوب الزرعي ابو عبدالله ابن القيم: اعلام الموقعين عن رب العالمين 'دار الحيل' بيروت ١٩٤٣ ع' طه عبدالروؤف سعد
- ٨- ابن تيمية: اقتضاء الصراط المستقيم مخالفة اصحاب الجحيم 'مطبعة السنة المحمدية' القاهرة 'طبعه دوم ١٣٢٩ هـ- تحقيق محمد حامد الفقى
- ٩- ناصر الدين عبدالله بن عمر البيضاوى: تفسير البيضاوى 'دار الفكر' بيروت
- ١٠- ابن تيمية: جامع الرسائل: تحقيق محمد رشاد رفيق سالم 'مصر
- ١١- محمد بن اسماعيل ابو عبدالله البخارى الجعفى: الجامع الصحيح 'دار ابن كثير' اليمامة 'بيروت طبعه سوم ١٢٠٤ هـ
- ١٢- ابن تيمية: الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح 'دار العاصمة' الرياض 'طبعه اولي ١٢١٢ هـ د/ على حسن ناصر' د/ عبدالعزیز ابراهيم العسكر' تحقيق د/ حمدان محمد
- ١٣- ابن القيم: الجواب الكافي لمن سأل عن الدواء الشافى (الداء والدواء) دار الكتب العلمية 'بيروت
- ١٤- ابن القيم: حاوى الأرواح الى بلاد الأفراس 'دار الكتب العلمية' بيروت-
- ١٥- محمد بن ابي بكر بن ناصر الدين دمشقى: الرد الوافر 'طبعه اولي ١٢٩٣ هـ' تحقيق زهير الشاويش
- ١٦- الشوكاني: رفع الريبة ضمن مجموعة الرسائل المنيرية 'طبعة اولي
- ١٧- محمد بن احمد بن عثمان بن قايماز الذبيبي ابو عبدالله: سير أعلام النبلاء 'مؤسسة الرسالة' بيروت ١٢١٣ هـ 'طبعه منهم' تحقيق شعيب الأرنؤوط 'محمد نعيم قسوسى
- ١٨- محمد بن على بن محمد الشوكاني: السيل الجرار المتدفق على حدائق الازهار (ف

- ١٣٥٠هـ) 'ناشر دار ابن حزم' طبعه اولى
- ١٩- ابن ابى العز الحنفى: شرح العقيدة الطحاوية' المكتب الاسلامى 'بيروت' طبعه چهارم ١٣٩١هـ
- ٢٠- كتاب الشرح والابانة على اصول السنة والديانة (الابانة الصغرى)' ص ٢٩٢ تحقيق د/رضا بن نعيان معطى-
- ٢١- ابن تيميه: الصارم المسلول على شاتم الرسول' دار ابن حزم' بيروت' طبعه اولى ١٤١٤هـ- تحقيق محمد كبير احمد چودهرى
- ٢٢- مسلم بن الحجاج ابو الحسين القشيري النيسابورى: صحيح مسلم' دار احياء التراث العربى' بيروت' تحقيق محمد فؤاد عبد الباقي
- ٢٣- ابن القيم: الصواعق المرسلة على الجهمية والمعتلة' دار العاصمة' الرياض' طبعه سوم ١٣١٨هـ/ ١٩٩٨ء' تحقيق د/على بن محمد الدخيل الله-
- ٢٤- عثمان بن عبد الرحمن ابو عمرو المعروف بابن الصلاح: صيانة صحيح مسلم من الاحلال والغلط وحمايته من الاسقاط والسقط' تحقيق موقف عبدالله ١٣٠٨هـ دار الغرب-
- ٢٥- ابن القيم: الطرق الحكمية فى السياسة الشرعية' مطبعة المدنى' القاهرة' تحقيق د/محمد جميل غازى
- ٢٦- عقيدة أحمد بن محمد بنحبل: رواية ابى بكر الخلال' دار قتيبيه' ط ١/ ١٣٠٨هـ تحقيق عبد العزيز عز الدين السيروانى-
- ٢٧- زين الدين بن ابراهيم بن محمد بن محمد بن بكر المشهور بابن النجيم الحنفى' دار الكتب العلمية' لبنان' بيروت' ١٣٠٥هـ/ ١٩٨٥- طبعه اولى تحقيق شرح مولانا السيد أحمد بن محمد الحنفى الحموى-
- ٢٨- أحمد بن على بن حجر ابو الفضل العسقلانى الشافعى' دار المعرفة' بيروت ١٣٤٩هـ
- ٢٩- ابن تيمية: الفتاوى الكبرى' دار المعرفة' بيروت' طبعه اولى ١٣٨٦هـ' تحقيق حسنين محمد مخلوف-
- ٣٠- ابو القاسم بن عبد الله بن الشاط: الفروق للقرافى مع أنوار البروق فى انواء الفروق' دار الكتب العلمية' بيروت ١٣١٨هـ/ ١٩٩٨ء' تحقيق خليل المنصور-
- ٣١- علاء الدين على بن سليمان المرادى: الفروع وتصحيح الفروع' تحقيق د/عبدالله التركى' ط ١
- ٣٢- ابو المظفر منصور بن محمد عبد الجبار السمعانى: قواطع الأدلة فى الأصول' دار الكتب العلمية' بيروت ١٣١٨هـ/ ١٩٩٤ء' تحقيق محمد حسن محمد حسن اسماعيل الشافعى-
- ٣٣- ابو محمد عز الدين بن عبد السلام السلمى: قواعد الأحكام فى مصالح الأنام' دار الكتب العلمية' بيروت-

- ٣٢- ابن حجر: لسان الميزان 'مؤسسة الأعلمی للمطبوعات' بیروت 'طبعه سوم' ١٢٠٦ هـ
١٩٨٢/ء دائرة المعارف النظامیه 'الهند-
- ٣٥- ابن تیمیة 'مجموع الفتاوى
- ٣٦- ابن القيم: مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد و ایاک نستعین 'دار الكتاب العربی'
بیروت 'طبعه دوم' ١٣٩٣ هـ / ١٩٤٣ء تحقیق محمد حامد الفقی-
- ٣٧- ابن تیمیة: منهاج السنة النبویة 'مؤسسة قرطبه' طبعه اولی '١٢٠٦ هـ تحقیق / محمد رشاد
سالم
- ٣٨- ابوزکریا یحی بن شرف بن مرى النووی 'المنهاج شرح مسلم' دار احیاء التراث العربی'
بیروت 'طبعه دوم' ١٣٩٢ هـ-
- ٣٩- ابراهیم بن موسی الشاطبی المالکی: الموافقات فی أصول الفقه 'دار المعرفه' بیروت'
عبدالله دراز
- ٤٠- ابن القيم: بداية الحیارى فی أجوبة اليهود والنصارى 'الجامعة الاسلامیه المدینة المنوره-

رابطہ عالم اسلامی

عالمی تنظیم علماء مسلمین

تعارف عالمی تنظیم

’عالمی تنظیم علماء مسلمین‘ رابطہ عالم اسلامی کی تنظیموں میں سے ایک تنظیم ہے جو اپنی مستقل شناخت رکھتی ہے اور جو علماء کی حیثیت کو مضبوط کرنے ’ان کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے اور بڑے بڑے مسائل میں ان کے یکساں موقف رکھنے کے لیے کوشاں ہے۔

مقاصد

- (۱) عالمی اور اسلامی مسائل میں علماء کے موقف میں یکسانیت کا حصول۔
- (۲) امت کی اسلامی شناخت کو برقرار رکھنا ’دنیا میں اس کی حیثیت کو مضبوط بنانا اور اس کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا۔
- (۳) علماء کی حیثیت کو باوقار اور مضبوط بنانا ’ان کے فرائض اور حقوق کو آشکار کرنا ’ان کی مدد اور ان کا دفاع کرنا اور ان کے مابین تعلقات کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا۔
- (۴) مختلف معاشروں کو پیش آمدہ مشکلات کا قابل قبول حل پیش کرنا۔
- (۵) مسلمانوں کے درمیان پیدا شدہ نزاعات کو حل کرنا۔
- (۶) جادہ حق سے ہٹے ہوئے نظریات اور اسلام دشمن افکار کا مقابلہ کرنا۔
- (۷) اسلام اور مسلمانوں کے مسائل کا دفاع کرنا اور ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنا جو ان کی دینی شناخت اور معاشروں کو درپیش ہیں۔

جنرل سیکرٹیریٹ
عالمی تنظیم علماء مسلمین

پوسٹ بکس 537 ’مکہ مکرمہ‘ سعودی عرب
موبائل نمبر : 00966558001743

ویب سائٹ : www.iomsmwl.org

ای میل : iomsmwl@gmail.com



رابطہ عالم اسلامی

عالمی تنظیم علماء مسلمین

تعارف عالمی تنظیم

’عالمی تنظیم علماء مسلمین‘ رابطہ عالم اسلامی کی تنظیموں میں سے ایک تنظیم ہے جو اپنی مستقل شناخت رکھتی ہے اور جو علماء کی حیثیت کو مضبوط کرنے، ان کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے اور بڑے بڑے مسائل میں ان کے یکساں موقف رکھنے کے لیے کوشاں ہے۔

مقاصد

- (۱) عالمی اور اسلامی مسائل میں علماء کے موقف میں یکسانیت کا حصول۔
- (۲) امت کی اسلامی شناخت کو برقرار رکھنا، دنیا میں اس کی حیثیت کو مضبوط بنانا اور اس کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا۔
- (۳) علماء کی حیثیت کو باوقار اور مضبوط بنانا، ان کے فرائض اور حقوق کو آشکار کرنا، ان کی مدد اور ان کا دفاع کرنا اور ان کے مابین تعلقات کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا۔
- (۴) مختلف معاشروں کو پیش آمدہ مشکلات کا قابل قبول حل پیش کرنا۔
- (۵) مسلمانوں کے درمیان پیدا شدہ نزاعات کو حل کرنا۔
- (۶) جادہ حق سے ہٹے ہوئے نظریات اور اسلام دشمن افکار کا مقابلہ کرنا۔
- (۷) اسلام اور مسلمانوں کے مسائل کا دفاع کرنا اور ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنا جو ان کی دینی شناخت اور معاشروں کو درپیش ہیں۔

جنرل سیکرٹریٹ

عالمی تنظیم علماء مسلمین

پوسٹ بکس 537، مکہ مکرمہ، سعودی عرب

موبائل نمبر : 00966 558001743

ویب سائٹ : www.iomsmwl.org

ای میل : iomsmwl@gmail.com